الرسالہ

Al-Risāla

March 1999 • No. 268 • Rs. 9

زندگی نام ہے —— کھوئے ہوئے مواقع کو بھلاکر ملے ہوئے
مواقع کو استعمال کرنے کا۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مارچ ۱۹۹۹ شمارہ ۲۶۸

فہرست — صفحہ

فہرست	صفحہ
جنتی انسان	۴
مسجد کی اہمیت	۵
سائنس کو پلس بنانا	۶
آواز بلند کرنا	۷
دینی تقاضے	۸
ریا، اخلاص	۹
پانچ اصول	۱۰
منافق کی پہچان	۱۱
غیر ذمہ دار صحافت	۲۱
بھوپال کا سفر	۱۶
شیطانی وسوسہ	۴۵
خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۷

جنتی انسان

جنت کا معاملہ کوئی گروہی معاملہ نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ کوئی گروہ بحیثیت گروہ جنتی ہو اور جب وہ لوگ آخرت میں پہنچیں تو ایک طرف سے پورے گروہ کو جنت میں داخلہ مل جائے۔ اسی طرح جنت میں داخلہ کا معاملہ کوئی سفارشی معاملہ بھی نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ کچھ لوگوں کو خدا کی طرف سے سفارش کے اختیارات دیئے گئے ہوں اور جس کے بارے میں وہ سفارش کریں ان کو جنت میں داخلہ دے دیا جائے۔ اسی طرح ایسا بھی نہیں کہ کچھ خارجی اعمال اپنے اندر پراسرار فضیلت رکھتے ہوں اور جو آدمی اپنے اعضاٗ وجوارح سے ان خارجی اعمال کو دہرادے وہ اپنے آپ جنت کا مستحق بن جائے۔

جنتی انسان کون ہے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: **ذلك جزاء من تزكى** (طٰہٰ: ٧٦) یعنی جنت کی قیمت تزکیہ ہے۔ جنت ان خوش نصیب افراد کو ملے گی جنھوں نے دنیا کی زندگی میں اپنا تزکیہ کیا ہو۔ جو ذہن مطہر اور قلب مصفّٰی لے کر آخرت میں پہنچیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں جنتی نفسیات کے ساتھ رہے۔ جن کی معرفت نے انھیں خدا میں جینے والا بنا دیا تھا۔ جن کو وہ گہرا ایمان حاصل تھا جو قول و عمل کا نور بن کر انسان کی زندگی میں شامل ہو جاتا ہے۔ جو مثبت نفسیات میں نہائے ہوئے تھے اور منفی نفسیات سے یکسر پاک تھے۔

جنت خدا کے پڑوس میں بننے والی لطیف و نفیس کالونی ہے۔ اس میں وہی لوگ بسائے جائیں گے جو خدا کی پسند کو اپنی پسند بنالیں۔ اور خدا کی ناپسند کو اپنی ناپسند، جو مادیات سے اس حد تک اوپر اٹھ جائیں کہ دنیا ہی میں ان کو جنت کی خوشبو محسوس ہونے لگے۔ جن کے لئے جنت اسی آج کی دنیا میں ایک جانی پہچانی چیز بن جائے (يدخلهم الجنة عرفها لهم)

مسجد کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ : المساجد بیوت المتقین (مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں) یعنی مسجد اہل تقویٰ کی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ مسجد وہ مقام ہے جس کے تحت متقیانہ زندگی کی سرگرمیاں عمل میں آتی ہیں۔

مسجد میں آس پاس کے مسلمان روزانہ پانچ بار اکٹھا ہوتے ہیں۔اس طرح ہر دن ان کی آپس میں ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ یہ ملاقات یا ملنا جلنا انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ اسی مقصد کے لئے کلب قائم کئے جاتے ہیں۔ مگر دونوں میں یہ فرق ہے کہ کلب میں لوگ دنیوی تفریح کی نسبت سے اکٹھا ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مسجد میں لوگ دین کی نسبت سے اکٹھا ہوتے ہیں۔ کلب اور اس طرح کے دوسرے مقامات اگر دنیوی مقاصد کے لئے اجتماع کی جگہ ہیں تو مسجد اخروی مقصد کے لئے اکٹھا ہونے کا مقام ہے۔

مسجد کے عمل کا آغاز اذان سے ہوتا ہے جو ایک خدا کی بڑائی کا اعلان ہے۔ مسجد میں آنے والے سب سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ یہ گویا اخلاقی پاکیزگی کا سبق ہے۔ پھر وہ مقرر عبادت کی صورت میں خدا کو یاد کرتے ہیں، وہ خدا کے کلام کو پڑھ کر اس کے تقاضوں کو اپنے ذہن میں تازہ کرتے ہیں۔ وہ رکوع اور سجدہ کی صورت میں یہ عزم کرتے ہیں کہ وہ سرکشی کو چھوڑیں گے اور متواضع زندگی گذاریں گے۔ جماعت کی صورت میں نماز ادا کر کے وہ اتحاد واتفاق کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ وغیرہ

اس طرح مسجد میں روزانہ پانچ وقت کا عباداتی اجتماع ہوتا ہے۔ یہ گویا پابند اوقات زندگی گذارنے کی ایک تربیت ہے۔ یہ مسلمانوں کو ڈسپلن والی زندگی گذارنے کا پیغام ہے۔ مسجد سے اس طرح کے بہت سے فائدے وابستہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد کا نظام اگر درست طور پر قائم رہے تو وہ اہل اسلام کے لئے ہر قسم کے فائدوں کا ذریعہ بن جائے۔ وہ ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو درست کر دے۔

مائنس کو پلس بنانا

جرمنی کے مشہور اسکالر الفرڈ ایڈلر (وفات ۱۹۳۷) کی ایک کتاب کا نام ہے: فرد کی نفسیات (The Individual Psychology) ایڈلر نفسیات کا عالم تھا اس نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی ساری عمر انسان کا مطالعہ کیا۔ اپنے اس لمبے مطالعہ کے بعد میں نے پایا کہ انسانوں کے اندر ایک بڑی انوکھی صفت ہوتی ہے اور وہ ان کی یہ طاقت ہے کہ وہ اپنے مائنس کو پلس بنا سکیں۔

Their power to turn a minus into a plus

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر ایک ہیرو ہوتا ہے۔ ہر انسان اپنے اندر یہ چھپی ہوئی صفت رکھتا ہے کہ وہ اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کر سکے، وہ ایک بار ناکام ہونے کے بعد دوبارہ اپنے آپ کو کامیاب بنا لے۔

ایک بار میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ وہ میٹرک کے امتحان میں دو بار فیل ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی زندگی سے اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ یہ سوچنے لگا تھا کہ مجھ کو خودکشی کر لینا چاہئے۔ میں نے اس کو الفرڈ ایڈلر کی یہ بات بتائی اور کہا کہ ابھی آپ نے اپنے کو کم استعمال کیا تھا اس لئے آپ فیل ہو گئے۔ اب آپ اپنے کو پہلے سے زیادہ استعمال کیجئے، اس کے بعد آپ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اب اس کے اندر ایک نیا حوصلہ جاگا۔ اس نے پہلے سے زیادہ محنت کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے جب تیسری بار میٹرک کا امتحان دیا تو وہ نہ صرف پاس ہوا بلکہ فرسٹ آیا۔ انسان اپنا تمام کام دماغ کی مدد سے کرتا ہے اور دماغ کے بارے میں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے امکانات بے پناہ ہیں۔ انسانی دماغ کی جو غیر معمولی صلاحیت ہے عام انسان اس کا پانچ فیصد حصہ بھی استعمال نہیں کر پاتے اور مر جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے دماغ کے خزانہ کا عام طور پر جتنا حصہ استعمال کرتا ہے اس کے بعد بھی اس خزانہ کا تقریباً ۹۵ فیصد حصہ استعمال کئے بغیر پڑا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسان کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ گویا کہ ہر انسان کے فطری بینک میں اتنا زیادہ رقم جمع ہے کہ مسرفانہ حد تک خرچ کرنے کے باوجود اس کا بینک کبھی خالی نہ ہو، وہ ہر حال میں سونے اور چاندی سے بھرا رہے۔

آواز بلند کرنا

اکبر الہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کے انداز میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

ظلم سے اکبر بتوں کے چپ نہ رہنا چاہئے اور کچھ نہ بن پڑے تو شعر کہنا چاہئے

یہ شعر اکثر انسانوں پر صادق آتا ہے۔ جن لوگوں کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالف حالات کو بدل سکیں، تو ایسے لوگ لفظی چیخ وپکار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جس کو وہ بطور خود "ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا" کہتے ہیں۔

اس قسم کا لفظی شور وغل یقینی طور پر بے معنی ہے۔ وہ سراسر بے فائدہ ہے۔ اس دنیا میں بہتر انسان وہ ہے جو بے فائدہ کاموں سے بچنے والا ہو۔

مزید یہ کہ یہ کام محض بے فائدہ نہیں بلکہ وہ مضر بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ناموافق حالات میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ تعمیر واستحکام کے ذریعہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنایا جائے کہ مخالفوں کے مخالفانہ منصوبے بے اثر ہو کر رہ جائیں۔ ایسی حالت میں جب بے نتیجہ شور وغل کو کام سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد ایسا ہوگا کہ لوگوں کی توجہ اصل کام سے ہٹ جائے گی۔ وہ سمجھیں گے کہ حالات کے مقابلہ میں ہم کو جو کچھ کرنا چاہیے وہ ہم کر رہے ہیں۔ یہ کوتاہی ان کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن جائے گی۔ عمل وہی ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جس عمل کا کوئی حقیقی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔ وہ کوئی عمل بھی نہیں۔ ایسی حالت میں "ظلم کے خلاف چیخ وپکار" مضر بھی ہے اور بے فائدہ بھی۔ وہ ایک نقصان کے بعد اپنے آپ کو دوسرے نقصان میں ڈالنا ہے۔

اس دنیا میں اس سے زیادہ تباہ کن کوئی چیز نہیں کہ نہ کرنے کو کرنا سمجھ لیا جائے۔ یہی وہ حقیقت جس کو قرآن میں لغو سے پرہیز کہا گیا ہے۔

دینی تقاضے

۱۔ دین میں پہلی چیز ایمان ہے۔ ایمان خدا کی معرفت کا نام ہے۔ ایک انسان پر جب یہ حقیقت کھلتی ہے کہ خدا اس کا رب ہے اور وہ اس کا بندہ، اور یہ کہ خدا نے اس کی ہدایت کے لئے محمد بن عبد اللہ کو اپنا رسول بنا کر اس کے پاس بھیجا ہے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہی ایمان ہے اور اسی کو کلمۂ اسلام کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایمان کی حقیقت سینہ میں اترنے کے فوراً بعد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے خالق ومالک کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام بہترین احساسات کو خدا کی طرف موڑتے ہوئے اس کا پرستار بن جاتا ہے۔ اسی کا نام شریعت میں عبادت ہے۔

۳۔ ایسے انسان کا سابقہ جب بندوں سے پڑتا ہے تو وہ اپنے مزاج کے تحت ہر ایک سے تواضع کے ساتھ پیش آتا ہے۔ وہ ہر ایک کا خیر خواہ بن جاتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سے کسی کو غیر انسانی سلوک کا تجربہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ روش ہے جس کا نام اسلامی اخلاق ہے۔ اسلامی اخلاق کے اصول پر قائم رہنے کے لئے صبر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ جو آدمی صبر کرنے کے لئے تیار نہ ہو وہ لوگوں کے ساتھ اسلامی اخلاق برتنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جس آدمی کے اندر ایمان کی کیفیت پیدا ہو جائے وہ اپنے قریبی ماحول کے بارہ میں غیر جانبدار بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس کا احساس مجبور کرتا ہے کہ وہ برا کرنے والوں کو برائی کرنے سے روکے اور لوگوں کو بھلائی کا طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب دے۔ اسی کا نام شریعت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

۵۔ آخری چیز دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی عام انسانوں کو خدا کے تخلیقی نقشہ سے باخبر کرنا۔ انسان کو اس کے رب سے جوڑنا۔ اس کو غیر خدا پرستانہ زندگی سے نکال کر خدا پرستانہ زندگی کی طرف لے آنا۔

ریا، اخلاص

قرآن وحدیث میں بتایا گیا ہے کہ خدا ریاؔ والے عمل کو کبھی قبول نہیں کرتا۔ وہ صرف اس مخلصانہ عمل کو قبول کرتا ہے جو صرف خدا کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔

سماجی زندگی میں جو اعمال کئے جاتے ہیں ان میں اکثر ریا والا عمل اور اخلاص والا عمل دونوں ظاہری صورت کے اعتبار سے یکساں ہوتا ہے۔ مثلاً علم دین کی اشاعت، مال خرچ کرنا، اخلاقی سلوک، دوسرں کی اعانت وغیرہ۔ یہ سارے اعمال ریاؔ کے جذبہ کے تحت بھی ہوسکتے ہیں اور خالص خدائی رضا کے تحت بھی۔

مگر ظاہری مشابہت کے باوجود دونوں میں اتنا بڑا فرق ہے کہ ریاؔ والے عمل پر سزا ہے اور اخلاص والے عمل پر انعام۔ ایک قسم کا عمل آدمی کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور دوسری قسم کا عمل جنت کی طرف۔

ایک پروفیشنل آدمی بھی لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ وہ اپنے اصحابِ معاملہ سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جو اللہ کے دین کی خاطر نرم کلامی اختیار کرتا ہے ۔وہ اللہ کے خوف سے لوگوں کے ساتھ اخلاق اور دیانت کا معاملہ کرتا ہے بظاہر دونوں قسم کے آدمیوں کا عمل بالکل یکساں ہے مگر ایک کے لئے آخرت میں کچھ نہیں، اور دوسرے کے لئے آخرت میں وہ سب کچھ ہے جس کو وہ چاہے۔

اسی طرح ایک تاجر ہے جو سماجی اداروں کو مال دیتا ہے مگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیوی نیک نامی حاصل کرے۔ وہ سیاسی لیڈروں کو چندہ دیتا ہے تاکہ وہ وقت پر اس کے کام آئیں۔ دوسری طرف وہ خداترس تاجر ہے جو خالص آخرت کے جذبہ کے تحت اپنا مال خرچ کرتا ہے جو دین کی راہ میں کوشش کرنے والوں کی مخلصانہ مدد کرتا ہے، صرف اس لئے کہ خدا اس سے راضی ہو۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے عمل کا انجام بھی ظاہری مشابہت کے باوجود یکساں نہیں۔ ان میں سے ایک خدا کے یہاں ناقابل قبول ہے اور دوسرا خدا کے یہاں پوری طرح قابل قبول۔

پانچ اصول

اصول فقہ کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ بیشتر قاعدے پانچ بنیادی اصولوں پر مبنی ہیں۔ ان پانچ اصولوں سے سیکڑوں ضابطے نکلتے ہیں جو بیشتر امور کو اپنے دائرہ میں لے لیتے ہیں۔ یہ سنہری اصول (القواعد الخمس الذهبية) یہ ہیں

١. الامور بمقاصدها	معاملات کا انحصار نیت اور قصد پر ہے
٢. اليقين لايزال بالشك	یقین کبھی شک سے زائل نہیں ہوتا
٣. الضرر يزال	نقصان کو دور کیا جائے گا
٤. المشقة تجلب التيسير	مشقت آسانی لے آتی ہے
٥. العادة محكمة	عرف اور رواج قابل لحاظ ہیں

آدمی جب بھی کوئی کام کرے یا کوئی قدم اٹھائے تو سب سے پہلے اس کی نیت دیکھی جائے گی۔ اگر اس کی نیت درست ہے تو اس کا اقدام بھی درست ہے اور اگر نیت درست نہیں تو اس کا اقدام بھی درست نہیں۔

ایک شخص کے عام حالات اگر اس یقین کی طرف لے جارہے ہوں کہ وہ صحیح آدمی ہے تو محض ایک بے بنیاد شک کی بنا پر اس کو غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگر ایک شخص تکلیف میں مبتلا ہے یا کوئی نقصان کی صورت پیدا ہو گئی ہے تو ہر حال میں اس کا ازالہ کیا جائے گا۔ خواہ وہ کسی کا بھی معاملہ ہو۔ بعض فیصلے بظاہر کسی شخص یا گروہ کو مشقت میں ڈالنے والے ہوتے ہیں، لیکن اگر فیصلہ صحیح ہے تو باعتبار انجام اس سے آسانی ظاہر ہو گی۔

جو چیزیں لوگوں کے درمیان پسندیدہ رواج کی حیثیت حاصل کرلیں، ان کی حیثیت بھی قانون کی ہے۔ امکانی حد تک ان پر عمل کیا جائے گا۔

منافق کی پہچان

منافق کون ہے۔ قرآن (آل عمران ۱۶۷) میں منافق کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بناوٹی باتیں کرتا ہے۔ اس کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ۔ قرآن کے الفاظ میں، ایسے لوگ اپنے منھ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے (یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم)

انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ مخلص اور منافق۔ مخلص انسان جب بولتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کے ہر لفظ کو سن رہا ہے۔ اس لئے وہ وہی بات کہتا ہے جو از روئے حق اسے کہنا چاہئے۔ اس بنا پر اس کے دل اور اس کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایسا انسان دہرا کلام (double talk) سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے مخلص انسان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی کوئی بات خدا سے چھپی ہوئی نہیں۔ اس بنا پر اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔

اس کے برعکس منافق انسان کا دل خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی نظر خدا پر نہیں ہوتی بلکہ انسان پر ہوتی ہے۔ انسان چونکہ اس کے دل کا حال نہیں جان سکتا اس لئے وہ انسان کو دھوکے میں رکھنے کے لئے اس سے بناوٹی بات بولتا ہے جو لوگوں کو خوش کرنے والی ہو۔ منافق انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں خود غرضی ہوتی ہے مگر وہ اپنی زبان سے غرض کی بات کرتا ہے۔ اس کے دل میں نفرت ہوتی ہے مگر اپنے منہ سے وہ محبت کے الفاظ بولتا ہے۔ اس کے دل میں ذاتی انٹرسٹ ہوتا ہے مگر اپنی زبان سے وہ اصول پسندی کی بات کرتا ہے۔ اس کا اصل مقصد اپنی خواہش کو پورا کرنا ہوتا ہے مگر زبان سے وہ دوسروں کی خیر خواہی کے الفاظ بولتا ہے۔

غیر ذمہ دار صحافت

بعض اردو اخبارات میں مراسلات کے کالم میں اکثر میرے خلاف ایسے خطوط اور مضامین چھپتے رہے ہیں جو سراسر الغواور بے بنیاد ہوتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں عام طور پر خاموشی کا رویہ اختیار کرتا ہوں اور مراسلہ نگاروں کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔ اس سے پہلے ایک بار اخبار قومی آواز میں میرے خلاف ایک بے بنیاد بات چھپی اس کی تردید میں میں نے ایک مراسلہ بھیجا جو قومی آواز (۵ مارچ ۱۹۹۵) میں چھپا۔ اس کو دیکھ کر تبلیغی جماعت کے معروف بزرگ مولانا اظہار الحسن صاحب مرحوم نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس میں مجھے خاموشی کے اصول پر برقرار رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے انھوں نے یہ شعر درج کیا تھا:

اشارتاً بھی نہ قصے بیاں کئے ہوتے

سئے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لئے ہوتے

اس کے بعد میں نے اعراض کے قرآنی اصول پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ مگر حال میں میرے خلاف جو جھوٹا اور شرانگیز پروپگنڈا کیا گیا ہے اس کی بنا پر میرے بعض دوستوں کا اصرار ہوا کہ میں اس کی کچھ وضاحت کروں۔

قومی آواز مورخہ ۹ جنوری ۱۹۹۹ میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے اس میں میرے خلاف جو باتیں کہی گئی ہیں وہ سب بلا شبہ بے بنیاد اور شرانگیز ہیں۔

اس خط میں جو بے اصل باتیں کہی گئی ہیں ان کا ماخذ ہندی اخبار پانچ جنیہ کا ایک شمارہ ہے۔ پانچ جنیہ اپنی متعصبانہ پالیسی کے لئے مشہور ہے۔ اس کے صفحات میں اکثر مسلمانوں اور مسلم شخصیتوں کے خلاف کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ یہ مراسلہ نگار اور مضمون نگار حضرات جب پانچ جنیہ کی ان رپورٹوں کو دیکھتے ہیں تو وہ فوراً ان کو یہ کہہ کر انھیں رد کر دیتے ہیں کہ یہ سب غلط پروپگنڈا ہے۔ مگر انھیں لوگوں کو جب اسی اخبار میں میرے خلاف ایک جھوٹا شوشہ ملا تو اس کو عین

درست سمجھ کر وہ اس کو ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر تیزی سے اس طرح پھیلانے لگے جیسے کہ وہ کوئی آسمانی صداقت ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ حضرات اپنی اس متضاد روش کا کیا جواز پیش کریں گے۔

اخباری رپورٹوں کے بارے میں عام طور پر یہ بات معلوم و معروف ہے کہ ان میں کبھی قصداً اور کبھی بلا قصد باتیں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی اخبار میں کوئی رپورٹنگ بالکل صحیح اور درست ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ افراد کبھی اخبار کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہیں کرتے۔ مگر ان اخباری مراسلہ نگاروں کی غیر ذمہ داری کا یہ حال ہے کہ وہ ایسی رپورٹوں کے بارے میں نہ اپنے کامن سنس کو استعمال کرتے اور نہ معاملہ کی وہ ضروری تحقیق کرتے جس کا قرآن میں صراحۃً حکم دیا گیا ہے۔ (الحجرات: ٦)

مثال کے طور پر قومی آواز کے مذکورہ مراسلہ میں میری بابت بتایا گیا ہے کہ میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ قرآن میں سنسکرت کے الفاظ بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ ایک جاہلانا بات ہے کوئی بھی عالم ایسی بات کہہ کر اپنی تضحیک کا سامان نہیں کر سکتا۔ میں نے جو کچھ کہا وہ صرف یہ تھا کہ اسلام کسی زبان سے تعصب نہیں سکھاتا۔ قرآن اگرچہ عربی زبان میں ہے مگر علماء نے لکھا ہے کہ اس میں کئی غیر عربی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا کہ قرآن میں سنسکرت کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک جاہلانا بات ہے جو کبھی میں نہیں کہہ سکتا۔ میری تحریں گواہ ہیں کہ میں ہمیشہ علم کی زبان میں کلام کرتا ہوں، جہالت کی زبان میں بولنا مجھے نہیں آتا۔

مذکورہ مراسلہ نگار نے اپنے مراسلہ میں مجھ کو ”بڑا عالم“ لکھا ہے۔ ان کا یہ اعتراف ہی کافی تھا کہ وہ مذکورہ قسم کی باتوں کو لغو پروپیگنڈا کہہ کر اسے رد کر دیں۔ اس لئے کہ کوئی بھی شخص جو قرآن وحدیث کا عالم ہو اس کا علم خود ایسے کسی فعل کے لئے ایک روک بن جائے گا۔ کیونکہ وہ محسوس کرے گا کہ ایک ایسی بات کہنا جو مسلمہ طور پر غیر علمی یا غیر اسلامی ہو، خود اپنی ہی زبان

سے اپنی تردید کرنا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنی حیثیت عرفی کو برباد کرنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ”رسول اللہ چار زبانوں کے عالم تھے جن میں سے ایک سنسکرت زبان ہے“ یہ بات بلاشبہ غیر علمی اور غیر تاریخی ہے۔ یہ اخبار کی خود ساختہ رپورٹ ہے۔ کوئی بھی عالم اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی بلا ثبوت بات کہے۔ خدا کے فضل سے میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ میں نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ رسول اللہ کے کاتب زید ابن ثابت انصاری (نہ کہ خود رسول اللہ) چار زبانیں جانتے تھے۔

ان چار زبانوں میں میں نے ہرگز سنسکرت کو شامل نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ چار زبانیں عربی، فارسی، عبرانی اور سریانی تھیں نہ کہ سنسکرت۔

یہ چند مثالیں یہ اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں کہ حال میں میرے خلاف جو بہتان طرازیاں کی گئی ہیں وہ سراسر بے اصل ہیں۔ اس قسم کی بہتان طرازی کا جواب یہ نہیں ہے کہ ان کا براہ راست جواب دیا جائے۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر وہ شعور جگایا جائے جس کے بعد وہ خود ایسی باتوں کا تجزیہ کر کے فوراً اسے رد کر دیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص اگر کہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو (نعوذ باللہ) مورتی پوجا کرنا چاہئے تو سننے والے کے اندر یہ شعور ہونا چاہئے کہ وہ اس کو سن کر خود اپنے کامن سنس سے اس کو لغو قرار دے دے۔ وہ کہہ دے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے حقیقت توحید اور حقیقت شرک کے نام سے خدا پرستی کی حمایت اور بت پرستی کی مخالفت میں زبردست کتابیں لکھی ہیں، اس لئے وہ ایسا کبھی نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کہے کہ ”مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ لکھا ہے کہ جس طرح کلیلہ و دمنہ پہلے سنسکرت میں لکھی گئی تھی مگر اب اس کا سنسکرت نسخہ معدوم ہے۔ البتہ فارسی سے کیا ہوا ابن مقفع کا عربی ترجمہ کلیلہ و دمنہ کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن بھی

پہلے سنسکرت میں اترا تھا اور پھر اس کا عربی ترجمہ موجودہ قرآن کی صورت میں کیا گیا"۔ کوئی شخص اگر اس قسم کی لغوبات کہے تو سننے والے کے اندر اتنی عقل ہونی چاہئے کہ وہ اس کو سنتے ہی اس کو رد کر دے۔ وہ کہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی جیسا عالم ایسا کبھی نہیں لکھ سکتا کیوں کہ یہ سراسر ایک جاہلانا بات ہے اور کوئی عالم اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ ایسی جاہلانا بات کہہ کر اہل علم کی نظر میں اپنے آپ کو مضحکہ خیز بنالے۔

آخر میں میں اس سلسلہ میں دو باتیں کہوں گا۔ ایک یہ کہ میرے بارے میں کوئی رائے خود میرے ماہنامہ الرسالہ یا میری کتابوں کے ذریعہ قائم کرنا چاہئے۔ دوسرے اخباروں کی بنیاد پر رائے قائم کرنا ہرگز درست نہیں۔ ان اخباروں میں ہر ایک کے بارے میں بے اصل باتیں چھپتی رہتی ہیں۔ کسی شخص کے خیالات کا صحیح ماخذ اس کی اپنی تحریریں ہیں نہ کہ دوسروں کی شائع کردہ اخباری رپورٹیں۔

دوسری بات یہ کہ میں تقریباً چالیس سال سے اسلام کی خدمت کر رہا ہوں۔ اس دوران مضامین اور کتابوں کی صورت میں میرے لاکھوں صفحات چھپ چکے ہیں۔ ان تحریروں میں ہمیشہ اسلام کی صداقت، خدا کی برتری، قرآن کی عظمت اور پیغمبر اسلام کے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔ میری بیشتر کتابوں کا موضوع توحید کا اثبات اور شرک والحاد کی تردید ہوتا ہے۔ حتی کہ معروف طور پر یہی میرا خاص موضوع ہے۔ میری کتابیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر مذہب اور جدید چیلنج، اللہ اکبر، عظمت اسلام، دین حق وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ میری چالیس سالہ اسلامی خدمات نے میری حیثیت عرفی یہی بنادی ہے کہ میں اسلام کی صداقت کو ثابت کرنا اور غیر اسلام کو دلائل کے ذریعہ رد کرنا اپنا مشن بنائے ہوئے ہوں۔ میری تمام تحریروں اور تقریروں کا مرکزی موضوع یہی ہے۔ ایسی حالت میں اگر کسی بدنام اخبار میں میرے بارے میں کوئی ایسی بات چھپے جو میری حیثیت عرفی کے خلاف ہو تو عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ اس کو پڑھنے والے فوراً ہی یہ کہہ کر اس کو رد کر دیں کہ: سبحنك هذا بهتان عظيم (النور ١٦)

بھوپال کا سفر

مہاتما گاندھی ۱۲۵واں جنم ورش سماروہ سمیتی مدھیہ پردیش کے تحت بھوپال میں آل انڈیا سمینار ہوا۔ اس کے پروگرام یکم اکتوبر ۱۹۹۸ سے شروع ہو کر ایک ہفتہ تک جاری رہے۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر اظہار خیال کے لئے مجھے حسب ذیل دو عنوان دیے گئے تھے۔

۱۔ ملٹی کلچر اور یونی کلچر

۲۔ امن کی طاقت اور جنگ کی طاقت

اس سفر میں مذکورہ دونوں موضوع پر خطاب کے علاوہ بھوپال کے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مقامی مسلمانوں کے کئی اجتماع میں اظہار خیال کا موقع ملا اور دوسرے مختلف تجربات پیش آئے۔ اس کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ کو مجھے دہلی سے روانہ ہو کر بھوپال پہنچنا تھا۔ آج رات کو ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں کسی مسلم ملک میں ہوں۔ وہاں حکومت سازی کے لئے الکشن کرائے گئے ہیں۔ اس الکشن میں ایک مسلم جماعت کامیاب ہوئی ہے۔ اس کے بعد اس مسلم جماعت کے لیڈر ایک جگہ اکٹھا ہوئے۔ یہ غالباً کسی مسجد کا صحن تھا۔ یہاں ان لوگوں نے اس مسئلہ پر بات چیت شروع کی کہ حکومت کس طرح بنائی جائے گی، اس کی پالیسی کیا ہوگی، وزارتی عہدوں کی تقسیم کس طرح کی جائے گی۔ اس بات چیت کے دوران لوگوں میں اختلاف ہوا۔ اس کے بعد وہ لوگ آپس میں لڑنے لگے۔ یہاں تک کہ باقاعدہ ہاتھاپائی کی نوبت آگئی۔ یہ لیڈر جو تقریباً ۲۰ کی تعداد میں تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو مار کر فرش پر گرادیا۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو ان کے جسم نیم مردہ حالت میں فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی لیڈر جس طرح آپس میں لڑ رہے ہیں یہ خواب

غالباً اسی کی ایک تعبیر ہے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ کی شام کو فلائٹ نمبر ۴۳۳ کے ذریعہ دہلی سے بھوپال کے لئے روانگی تھی۔ گھر سے ایرپورٹ تک کا سفر معمول کے مطابق ہوا۔ سڑک پر کاروں کی کثرت تھی۔ مغرب کے ترقی یافتہ شہروں میں بھی کاروں کی کثرت ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ وہاں معیاری سڑک بھی موجود ہوتی ہے جس پر یہ کاریں دوڑ سکیں۔ ہر طرف صفائی ہوتی ہے۔ فضا بڑی حد تک کثافت سے پاک ہوتی ہے۔ سڑکوں پر ہر آدمی اپنی لین میں گاڑی چلاتا ہے۔ ہمارے یہاں کار تو آگئی مگر صحیح معنوں میں ہمارے یہاں اس کے مطابق سڑک کا نظام (matching road infrastructure) موجود نہیں۔

یہی دہلی کا قدیم ائرپورٹ ہے جس کو پہلے پالم ائرپورٹ کہا جاتا تھا۔ چند سال پہلے آگ لگنے سے یہ ائرپورٹ جل گیا۔ اس کے بعد یہاں از سر نو نیا ائرپورٹ بنایا گیا ہے۔ نیا ائرپورٹ پہلے ائرپورٹ کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑا ہے۔ وہ قدیم طرز کا تھا یہ بالکل جدید طرز کا ہے۔ اس دنیا میں امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ ہر تباہی کے بعد یہاں نیا شاندار تر امکان ابھر آتا ہے۔

۳۰ ستمبر کے اخبار میں دوسری خبروں کے ساتھ ایک خبر یہ تھی کہ روس کی حکومت نے کھلے طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ امریکہ کی مخالفت کے باوجود انڈیا کے لئے اس کی فوجی سپلائی (military supplies) جاری رہیں گی۔ یہ خبر اس طرح تھی جیسے کہ روس کی حکومت انڈیا کی بہت ہمدرد ہے اور وہ کسی کی مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اس کی فوجی امداد کر رہی ہے۔ حالانکہ یہ مکمل طور پر ایک تجارتی معاملہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ روس کو اپنی تباہ شدہ اقتصادیات کو سنبھالنے کے لئے ڈالر کی شدید ترین ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ہندستان اس کا زبردست معاون ہے کیوں کہ ہندستان روس سے اس کے غیر معیاری ہتھیاروں کو خریدنے کے لئے ہر سال روس کو دو بلین ڈالر دے رہا ہے۔ ہندستان میں کام کرنے والے روس کے فوجی ماہرین کی بڑی بڑی

تنخواہیں اس کے علاوہ ہیں۔

انڈین ائر لائنز کے کرایہ میں یکم اکتوبر ۱۹۹۸ سے ۱۱ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ دہلی سے بھوپال آتے ہوئے میں سابقہ کرایہ پر یہاں آیا مگر ۳ اکتوبر کو جب میں بھوپال سے دہلی کے لئے واپس ہوا تو میرے میزبانوں کو مزید رقم ادا کر کے اس کو دوبارہ کنفرم کرانا پڑا۔ اس قسم کا اضافہ انڈین ائر لائنز میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ پہلی بار جب میں انڈین ائر لائنز کے ذریعہ بھوپال آیا تو اس وقت اس کا کرایہ تقریباً دو ہزار روپیہ تھا۔ اب یہ کرایہ تقریباً سات ہزار روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔

حکومت جب بھی انڈین ائر لائنز کے کرایہ میں اضافہ کرتی ہے تو اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ائر لائنز کو گھاٹا ہو رہا ہے۔ یہ بیان غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انڈین ائر لائنز اور ائر انڈیا دونوں گھاٹے کا شکار ہو رہی ہیں مگر اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہندستان کی یہ ہوائی کمپنیاں خالص تجارتی اصول پر چلائی جا رہی ہیں پھر بھی یہ خسارہ کیوں ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ انڈین ائر لائنز اور ائر انڈیا میں ہر سطح پر لوٹ جاری ہے۔ اس لوٹ نے ان سرکاری اداروں کو خسارہ میں مبتلا کر رکھا ہے۔

۳۰ ستمبر کے اخبار میں ایک خبر یہ تھی کہ حکومت ہند نے ایک جائزے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ تیرہ سو قوانین کو ختم کر دیا جائے۔ آزادی کے بعد ہندستان میں ویلفیر اسٹیٹ قائم کرنے کے نام پر بے شمار قوانین بنائے گئے۔ ان کی تعداد تیرہ سو نہیں بلکہ تیرہ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ یہ قوانین ملک کی ترقی میں صرف رکاوٹ ثابت ہوئے۔ ان قوانین نے سرکاری کارکنوں کے اختیار میں غیر معمولی اضافہ کر دیا جس کا لازمی نتیجہ کرپشن میں اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تیرہ سو قوانین کا خاتمہ قانون کے مصنوعی جھاڑ جھنکاڑ کے صرف ایک چھوٹے سے جز کا خاتمہ ہے۔ اگر ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہے تو ان سارے ہی قوانین کو ختم کرنا ہوگا جو ویلفیر سوسائٹی کے نام پر بنائے گئے ہیں۔ زندگی کا ایک ہی صحیح قانون ہے اور وہ نیچر ہے۔ انسانی قوانین نیچر کے صحیح نظام میں صرف بیجا مداخلت ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام مصنوعی

قوانین کو ختم کردیا جائے تاکہ انسانیت کا قافلہ فطرت کی شاہراہ پر چلنے لگے۔

۳۰ ستمبر کی شام کو جب جہاز مجھ کو لے کر بھوپال کی طرف اڑا تو اچانک یہ سوچ کر میرے جسم میں تھرتھری پیدا ہوگئی کہ اسی طرح ایک روز موت کا فرشتہ آئے گا اور مجھ کو ایک دنیا سے اٹھا کر ایک اور سواری میں رکھے گا اور دنیا سے آخرت کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ میرا موجودہ سفر ایک گھنٹہ پانچ منٹ کا ہے۔ دوسرا سفر شاید ایک منٹ پانچ سکنڈ کا ہو۔ یہ ایک منٹ اور پانچ سکنڈ اتنے زیادہ قیامت خیز ہوں گے کہ شاید کائنات کی پوری تاریخ اس میں سمٹ جائے۔ یہ مختصر لمحہ شاید میری زندگی کا طویل ترین لمحہ ہوگا۔ مگر مجھے یا کسی کو نہ اس کے آغاز کا علم ہے اور نہ اس کے انجام کا علم۔ دہلی سے بھوپال تک کی پرواز ایک گھنٹہ پانچ منٹ کی تھی۔ یہ جہاز بھوپال ہوتے ہوئے اندور جاتا ہے۔ جہاز کے اندر لوگ بے فکری کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ کچھ لوگ ہنس ہنس کر اپنے الفاظ بکھیر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کی اس بے فکری کی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی پسندیدہ منزل کی طرف جارہے ہیں۔ اگر انھیں معلوم ہو کہ ہر ایک کے لئے اچانک ایک اور منزل آنے والی ہے اور وہ موت کی منزل ہے اور یہ منزل ان پر کسی بھی لمحہ آسکتی ہے۔ اگر لوگوں کو اس حقیقت کا زندہ شعور حاصل ہو تو ان کے قہقہے بند ہو جائیں اور وہ بولنے سے زیادہ چپ رہنا پسند کریں۔

جہاز تقریباً ایک گھنٹہ لیٹ ہو کر بھوپال پہنچا۔ ائرپورٹ پر کانفرنس کی طرف سے مسٹر کنک تیواری اور ان کے ساتھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ حلقۂ الرسالہ کے رفقاء بھی آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں سے ملنے کے بعد ائرپورٹ سے شہر کے لئے روانگی ہوئی راستہ میں ہر طرف دسہرہ کی دھوم نظر آئی لاؤڈ اسپیکر پر گانے کا شور اور بجلی کی روشنیوں کی جگمگاہٹ کے درمیان ہماری گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ لوگ اس قسم کی چیزوں کو جشن کا نام دیتے ہیں اور پھر لطف اندوز ہوتے ہیں مگر میرے لئے اس قسم کی چیزیں ایک مصیبت سے کم نہیں۔

پہلے ہم لوگ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی (فون نمبر 74981) کے مکان پر پہنچے۔ یہاں حلقۂ الرسالہ کے کئی لوگ موجود تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی (ریڈر شعبہ عربی بھوپال یونیورسٹی) کے ساتھ ایک مہینہ پہلے سخت حادثہ پیش آیا تھا ایک ٹرک ان کی گاڑی سے ٹکرا گیا جس کے نتیجہ میں انھیں سخت چوٹیں آئیں تاہم اب وہ بڑی حد تک صحت مند ہو چکے ہیں انشاء اللہ دو ہفتہ میں مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے حادثہ کی روداد بتاتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مصیبت میں بھی رحمت کا پہلو رکھ دیا ہے۔ اس قسم کے ناخوشگوار واقعات آدمی کے لئے ایک روحانی خوارک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آدمی پر اگر مصیبت نہ پڑے تو وہ ذہنی اور روحانی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی اس بات کی تائید میں میں نے یہ شعر انھیں سنایا:

اذا اشتدت بك البلویٰ ففكر فی الم نشرح فعسر بين يسرين اذا فكرته ففرح

یہاں سے روانہ ہو کر ہم لوگ لیک ویو اشوک ہوٹل میں پہنچے یہاں مجھے کمرہ (نمبر ۳۰۸) میں ٹھہرنا تھا۔ میرے ہمراہ یہاں جناب عبد الحمید ندوی بھی تھے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ کی شام کو سورج غروب ہوا تو میں دہلی میں تھا۔ اگلے دن یکم اکتوبر ۹۸ء کی صبح کو نیا سورج نکلا تو میں بھوپال میں تھا۔ اس کو سوچ کر مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ عمر بن عبد العزیز اموی اپنی ابتدائی زندگی میں ایک عام آدمی کی مانند تھے۔ وہ شاندار کپڑے پہنتے اور بہت زیادہ خوشبو لگاتے تھے وہ جدھر سے گذرتے ان کی شان و شوکت کی بنا پر لوگ انھیں دیکھنے لگتے۔ یہاں تک کہ ان کی چال کو مشیۃ العمریہ کہا جانے لگا۔ اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جس نے ان کی زندگی کو بالکل بدل دیا۔ ایک روز وہ اپنی ایک خادمہ پر غصہ ہو گئے اور اس کو مارنا چاہا، خادمہ کی زبان سے نکلا: اذكر ليلة صبيحتها يوم القيامة (اس رات کو یاد کرو جس کی صبح قیامت ہو گی) یہ الفاظ سن کر حضرت عمر بن عبد العزیز کانپ اٹھے اور اس کے بعد ان کی زندگی میں وہ انقلاب آ گیا جس کو ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اسی قسم کے انقلابی تجربوں کو شاعر نے اپنی زبان میں اس طرح

بیان کیا ہے:

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک جام　　　　نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

بھوپال سے کرانکل نام سے ایک انگریزی اخبار نکلتا ہے اس کے صفحہ اول پر ایک خبر تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۴ فروری ۹۸ء کو کوئمبٹور میں مسٹر لال کرشن اڈوانی کے جلسہ میں جو بم دھماکہ ہوا تھا اس کے سلسلہ میں پولس نے اسپشل انکوائری کی اور اب ۱۶۶ مسلمانوں پر کیس قائم کیا گیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد کوئمبٹور کے مسلم نوجوانوں کی ایک خفیہ تنظیم الامہ کا انکشاف ہوا جس کے بانی کا نام ایس اے پاشا بتایا گیا ہے۔ پرجوش نوجوانوں کی یہ تنظیم بابری مسجد کے حادثہ کے بعد بنائی گئی تھی۔ ان لوگوں نے بڑی تعداد میں بم تیار کیے تھے اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جگہ جگہ بم دھماکے کرکے بابری مسجد کا انتقام لیں مگر عملاً اس کا نتیجہ الٹا ہوا۔ پولس نے سینکڑوں مسلمانوں کو گرفتار کرلیا۔ ان کی بری طرح مار پیٹ ہوئی۔ کئی لوگ مرگئے۔ وہ سارے بم پکڑ لئے گئے جو گھروں میں چھپائے گئے تھے۔ سینکڑوں مسلمانوں کی زندگیاں تباہ ہوکر رہ گئیں۔ فساد کے نتیجہ میں مسلمانوں کو جو اقتصادی نقصان پہنچا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس واقعہ میں سبق کی بات یہ ہے کہ ۱۴ فروری کے بم دھماکہ کے بعد وہاں کی پولس نے زبردست مظالم کئے مگر کوئمبٹور یا تامل ناڈ کے مسلمانوں کی طرف سے کوئی ردّعمل سامنے نہیں آیا۔ انھوں نے پولس کے مظالم کے خلاف کوئی اخباری دھوم نہیں مچائی۔ اسی طرح تقریباً اسی زمانہ میں مہاراشٹر کے سری کرشنا کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں بمبئی کے فساد دسمبر ۹۲ء جنوری ۱۹۹۳ کا ذمہ دار یک طرفہ طور پر ہندو لیڈروں اور پولس کو قرار دیا تھا۔ اس رپورٹ کو مہاراشٹر کی بھاجپا، شوسینا حکومت نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ وہ اینٹی ہندو اور پرو مسلم ہے۔ یہ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ تھا۔ مگر مہاراشٹر کے مسلمانوں نے اس کو کامل خاموشی کے ساتھ گوارہ کرلیا۔

یہ ہندستانی مسلمانوں میں ایک سیاسی تبدیلی کی علامت ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کے آخری زمانہ میں مسلمانوں میں ایک تبدیلی کا مشاہدہ ہوا تھا۔ اس پر مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ میں ایک طویل مقالہ لکھا تھا جس کا عنون تھا مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ۔ اب ۸۵ سال بعد ہندستان کے مسلمانوں میں اس سے بھی زیادہ بڑی پولٹیکل تبدیلی آئی ہے۔ یہ تبدیلی حیرت انگیز طور پر عین وہی ہے جس کے لئے الرسالہ کے ذریعہ پچھلے ۲۵ سال سے کوشش کی جارہی تھی۔ یعنی واقعات پر منفی ردّ عمل کے بجائے حقیقت پسندانہ روش اختیار کرنا۔

بھوپال میں میرا قیام جس ہوٹل میں تھا وہ ایک وسیع جھیل کے کنارے واقع ہے۔ ہوٹل کا پشت کا دروازہ کھول کر میں اپنے کمرہ کی بالکنی میں آیا تو سامنے دور تک نہایت پر کشش منظر تھا۔ میں جب بھی اس قسم کے مناظر کو دیکھتا ہوں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ منظر میرے لئے ایک آئینہ بن جاتا ہے جس میں میں جنت کی جھلک دیکھ سکوں۔ موجودہ دنیا میں تکلیف کے مناظر بھی ہیں اور مسرت کے مناظر بھی۔ تکلیف کے مناظر اس لئے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر جہنم کو یاد کرے، اور مسرت کے مناظر اس لئے ہیں تاکہ آدمی جب انہیں دیکھے تو ان میں جنت کی جھلکیاں دکھائی دیں اور پھر اس تجربہ کے بعد جہنم سے ڈرے اور جنت کا حریص بنے۔

بھوپال کے انگریزی روزنامہ ''نیشنل میل'' کا شمارہ یکم اکتوبر ۹۸ دیکھا اس میں ایک مضمون اسرائیل کے بارے میں تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ ہندستان اور اسرائیل دونوں نے ۲۰ویں صدی کے وسط سے اپنی زندگی کا آغاز کیا مگر آج دونوں میں غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ اسرائیل نے زیرو لیول سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا مگر انتہائی چھوٹا ملک ہونے کے باوجود آج وہ ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندستان بہت بڑا ملک ہے اور اس کے پاس ہر قسم کے وسائل ہیں مگر ترقی کے اعتبار سے ممالک کی فہرست میں اس کا شمار ۱۳۸ نمبر پر ہوتا ہے۔ جائزہ نگار نے اس فرق کا کوئی سبب نہیں بتایا تھا۔ میرے نزدیک اس کا سبب صرف ایک ہے اور وہ

یہ کہ اسرائیل کے باشندوں میں اعلیٰ درجہ کی نیشنل اسپرٹ پائی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندستان میں صرف لوٹ کی اسپرٹ ہے۔ اس کے سوااور کچھ نہیں۔

بھائی الطاف بھوپال کی ایک خاص شخصیت ہیں۔ ان سے ایک گفتگو کے دوران میں نے کہاکہ میری عمر ہجری کلینڈر کے لحاظ سے اب ۸۷ سال ہو رہی ہے۔ اس مدت میں میں نے بہت کچھ پڑھااور دیکھا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ انسان کا آخری ٹسٹ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آپ کے اور اس کے درمیان انا کا ٹکراؤ پیدا ہو۔ اس ٹسٹ سے پہلے کسی انسان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ کسی آدمی کا خوش اخلاق یا مخلص ہونا صرف اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کہ وہ اس نازک ٹسٹ پر پورا اترے۔

ڈاکٹر حمید اللہ ندوی بھوپال یونیورسٹی میں شعبہ عربی میں ریڈر ہیں۔ ان سے ایک گفتگو کے دوران میں نے کہاکہ پیغمبر اسلام کی بہت سی سنتیں ایسی ہیں جن کو شاید ہمارے علماء بھی نہیں جانتے، حتیٰ کے شاید وہ لوگ بھی نہیں جنھوں نے سیرت رسول پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک سنت حقیقت پسندی ہے۔

حقیقت پسندی کیا ہے۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ آدمی اپنے خیالات سے باہر کے حالات کو جانے اور اس کی رعایت کرے۔ اس دنیا میں کسی بھی شخص کے لئے حتیٰ کہ پیغمبر کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خارجی پہلوؤں کے علی الرغم اپنے نظریہ کو واقعہ بنا سکے۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں مگر اس کے ڈھائی مہینہ بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ خلیفہ کس کو بنایا جائے تو حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے یہ حدیث پیش فرمائی کہ الائمۃ من قریش۔ یعنی خلیفہ صرف قریش میں سے ہوگا۔ یہ دونوں باتیں واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اصولی طور پر وہی بات درست ہے جس کا اعلان حجۃ الوداع میں کیا گیا تھا۔ مگر اجتماعی زندگی میں ہمیشہ عملی حقیقتوں سے سمجھوتا

کرنا پڑتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ نظری معیار دماغ سے نکل کر عالم خارجی میں واقعہ بن جائے۔

مسٹر ایم ہاشم (tel76375) اور مسٹر ایس مسعود حسن (tel 0755-581056) دونوں صاحبان فارسٹ کے محکمہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ قابل بقا سماج (sustainable society) کیسے قائم ہوتا ہے، اور موجودہ زمانہ میں ایسے سماج کے قیام میں سب سے بڑا خطرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مفید باتیں ہوئیں۔ مثلاً انسانی زندگی کے سلسلہ میں درختوں کا کردار اور جانوروں کا سلوک (animal behavior) وغیرہ۔ ایس مسعود حسن صاحب کا سابقہ بار بار جنگلی جانوروں سے پڑا ہے۔ انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا کہ ایک بار جنگل میں ایک شیرنی نے ایک عورت کا شکار کیا اور اس کو گھسیٹ کر جھاڑی میں لے گئی۔ وہاں اس کے بچے اس کو کھانے لگے۔ جناب حسن صاحب وہاں کے کچھ آدیواسیوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکلے یہاں تک کہ وہ اس جھاڑی کے پاس پہنچ گئے جہاں شیرنی کے بچے شکار کو کھا رہے تھے اور شیرنی وہاں بیٹھی ہوئی ان کی پہرہ داری کر رہی تھی۔ جناب حسن صاحب اور ان کے ساتھی اس وقت صرف پانچ میٹر کے فاصلہ پر تھے۔ شیرنی نے ان لوگوں کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ جناب حسن صاحب کے دوسرے ساتھیوں نے کہا کہ ہمیں فوراً فائر کرنا چاہئے لیکن جناب حسن صاحب نے سوچا کہ یہ عقل مندی کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ اگر ہماری گولی اس کو لگ جائے تب بھی وہ فوراً نہیں مر جائے گی۔ وہ زخمی ہو کر ہمارے اوپر حملہ کرے گی اور اس حملہ میں وہ ہم میں سے کم سے کم دو آدمیوں کو ختم کر دے گی۔

جناب حسن صاحب حیوانات کے سلوک کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں۔ چند سیکنڈ کے اندر ان کے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت شیرنی اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے یہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ یہاں سے صرف اس وقت ہٹے گی جب کہ اس کو اپنے بچوں کے بارے میں کوئی خطرہ محسوس نہ ہو ورنہ وہ اپنی جگہ بیٹھی رہے گی۔ یہ سوچ کر جناب حسن صاحب نے اپنے

ساتھیوں سے کہا کہ ہمیں فوراً اپنے آپ کو یہاں سے پیچھے لے جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے وہاں سے ہٹ کر دور چلے گئے۔ اس کے بعد شیرنی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اس نے ان لوگوں پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے کہا کہ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے اپنے انٹرسٹ میں مصروف ہے۔ یہاں کسی انسان کے شر سے بچنے کی واحد کامیاب تدبیر یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس سے دور رکھا جائے۔ کوئی انسان خواہ بظاہر شریر ہو یا غیر شریر، اس سے خطرہ صرف اس وقت ہے جب کہ آپ اس سے الجھ کر اس کو یہ احساس دلائیں کہ آپ اس کے انٹرسٹ کے لئے خطرہ ہیں۔ جب تک ایسا نہ ہو کوئی انسان یک طرفہ طور پر آپ کے اوپر حملہ کرنے والا نہیں۔

یکم اکتوبر کو ۱۰ بجے ٹی ٹی نگر کی مسجد میں ایک اجتماع ہوا۔ یہاں اسکول اور کالج کے طلبہ شریک ہوئے، اسی کے ساتھ بڑی عمر کے لوگ بھی موجود تھے۔ میں نے علم کی اہمیت کے موضوع پر خطاب کیا۔ تقریر کے بعد لوگوں نے سوالات کئے جس کا جواب دیا گیا۔

ایک سوال یہ تھا کہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام کس طرح کیا جائے۔ میں نے کہا کہ اس کا کوئی لگا بندھا طریقہ نہیں۔ دعوت کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ معتدل فضا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان انٹر ایکشن ہو۔ مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ جب دونوں فرقوں میں نفرت کی فضا نہ ہو اور دونوں کے درمیان آزادانہ اختلاط ہو تو دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جاتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ ابھی تو مسلمانوں کی اصلاح ہی نہیں ہوئی پھر غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت پہنچانے کا کیا سوال۔ میں نے کہا کہ یہ ایسا ہی ہے کہ ابھی تو مسجد ہی نہیں پھر مدرسہ بنانے کا کیا سوال ہے۔ اگر مدرسہ نہیں ہوگا تو مسجدوں کے لئے امام اور قاری کہاں سے آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں بیک وقت کئی کام کرنے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی

اصلاح کی کوشش بہت بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ ہر مسلم ادارہ اور ہر مسلم جماعت اسی کام میں مصروف ہے۔ لیکن غیر مسلموں میں دعوت کا کام سرے سے نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے میں دعوت پر زور دیتا ہوں۔

مسٹر راہل پردھان نے یہ سوال کیا کہ ہندوؤں میں بھگوان کا آ کار مانا جاتا ہے چنانچہ بھگوان کو ہم مورتی کے روپ میں دیکھ لیتے ہیں مگر اسلام میں خدا کا کوئی آ کار نہیں ہے اس لئے اسلام میں خدا کو دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ بھگوان کی مورتی کہتے ہیں اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ بھگوان کا آ کار ہے۔ کیا وہ مورتی خود بھگوان نے آسمان سے اتاری ہے یا کسی نے بھگوان کو اس کے اصلی روپ میں دیکھا ہے، اور پھر اس نے اس کی نقل مورتی کی صورت میں تیار کی۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت نہیں جس چیز کو آپ بھگوان کی مورتی کہتے ہیں وہ خود آپ کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی شکلیں ہیں پھر ایسی خود ساختہ مورتی کو دیکھنا خدا کو دیکھنا کیسے ہو جائے گا۔ دنیا میں ہم بہت سی چیزوں کو اس کی مجسم صورت میں نہیں دیکھتے بلکہ تصوراتی طور پر دیکھتے ہیں مثلاً لا آف موشن وغیرہ۔ پھر جس طرح کائنات کی دوسری بہت سی حقیقتوں کو ہم دیکھے بغیر مانتے ہیں اسی طرح ہم خدا کو بھی دیکھے بغیر مان سکتے ہیں۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ ایک پرچہ میں آپ کی تصویر چھپی ہے جس میں آپ آرتی اتارتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کیا یہ واقعہ ہے۔

میں نے کہا کہ یہ تو بہت آسان ہے، میں آپ کی بھی ایک ایسی تصویر بنا سکتا ہوں جس میں آپ بھی آرتی اتارتے ہوئے دکھائی دیں، کوئی بھی فوٹوگرا فر کسی بھی شخص کو اس قسم کے کسی عمل کے ساتھ دکھا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ آج سے ساٹھ سال پہلے نوجوانی کی عمر میں میں فیض آباد گیا۔ وہاں میرے ایک تعلیمی ساتھی تھے جن کا نام عطاء الرحمٰن تھا۔ وہ مجھ کو ایک فوٹو

گرافر کے یہاں لے گئے جہاں اس نے ہم دونوں کے فوٹو لئے، بعد کو انھوں نے مجھے ایک ایسی تصویر دی جس میں میں ایک ہوائی جہاز کے اندر بیٹھا ہوا تھا، میں نے کہا کہ میں تو آج تک ہوائی جہاز میں بیٹھا ہی نہیں، پھر اس قسم کی تصویر کیسے بن گئی، انھوں نے بتایا کہ یہ تصویر فوٹو گرافر نے تیار کی ہے، اس نے یہ کیا کہ آپ کی ایک تصویر لے کر اس کو ہوائی جہاز کی تصویر کے ساتھ چپکا دیا، پھر دوبارہ اس کی تصویر لے لی۔

اس قسم کی تصویر کشی اس زمانہ میں اتنی عام ہو چکی ہے کہ اب ہر آدمی اس معاملہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔

یکم اکتوبر ۹۸ کو دوپہر کا کھانا جناب ایس ایم حسن صاحب کے مکان پر تھا، اس سلسلہ میں یہاں ایک درجن سے زیادہ آدمی اکٹھا ہو گئے۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، جناب ایس ایم حسن صاحب کو اپنی سروس کے تحت بار بار جنگل میں جانا ہوتا ہے وہاں آدی واسی لوگ رہتے ہیں، ایک بار انھوں نے کچھ آدی واسیوں سے پوچھا کہ سرکار اگر آپ کو مدد دینا چاہے تو آپ اس سے کس قسم کی مدد چاہیں گے۔ ایک بوڑھے آدی واسی نے دیر تک سوچا اور کہا کہ نمک۔ پھر انھوں نے دوبارہ سوال کیا کہ اور کیا چیز آپ چاہیں گے۔ آدی واسی نے دوبارہ سوچ کر کہا کہ مٹی کا تیل۔

میں نے سوچا کہ آدی واسی کے فہم کی آخری حد یہی تھی۔ اگر وہ زیادہ باشعور ہوتا تو شاید وہ کہتا کہ سرکار ہمارے بچوں کے لئے تعلیم کا انتظام کرے۔

یکم اکتوبر کو ظہر کی نماز ٹیٹی نگر کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد یہاں ایک اجتماع ہوا جس میں زیادہ تر الرسالہ کے قارئین تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج پورا ملک الرسالہ کی پالیسی کو اختیار کئے ہوئے ہے۔ کوئی اعلان کے ساتھ اور کوئی بلا اعلان۔

۱۹۴۷ کے بعد تمام بے ریش و باریش قائدین صرف ایک ہی بات جانتے تھے کہ انڈیا

مسلمانوں کے لئے ایک پرابلم کنٹری ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی پوری سیاست، صحافت وقیادت احتجاج کے رخ پر چل پڑی۔ فرقہ پرست طاقتوں سے لڑنا اور شکایات و مطالبات کا طوفان کھڑا کرنا اسی کا نام مسلم سیاست تھا ۱۹۶۴ سے الجمعیۃ ویکلی کے ذریعہ اور ۱۹۷۶ سے الرسالہ منتھلی کے ذریعہ میں نے یہ پیغام دینا شروع کیا کہ مسائل زندگی کا حصہ ہیں۔ انڈیا ہی نہیں بلکہ پورا ورلڈ پرابلم ورلڈ ہے۔ ہم کو پرابلم کے درمیان جینا سیکھنا چاہئے۔ اس کے سوا زندگی کا کوئی اور راستہ نہیں۔

لمبی مدت تک یہ آواز لوگوں کے لئے اجنبی بنی رہی مگر دھیرے دھیرے حالات بدلے اور آج انڈیا کے تمام مسلمان اس الرسالہ پالیسی پر قائم ہیں۔ اس معاملہ کو مختلف مثالوں سے واضح کیا۔

جناب محمد عمران صاحب اور جناب بلال الدین صاحب اور مولوی شمس الدین صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ دنیا میں زندگی گذارنے کے تین درجے ہیں ____ ضرورت، راحت اور عیش۔ necessity, comfort, luxury

پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی ناگزیر ضرورتوں کے دائرے میں زندگی گذارے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ راحت کے سامان بھی استعمال کرے۔، تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ عیش و تکلف کی زندگی گذارے۔ مثلاً تخت پر سونا آدمی کی ضرورت ہے۔ فوم کا گدا استعمال کرنا راحت ہے اور ائر کنڈیشنڈ کمرہ میں رہنا عیش ہے۔ میں نے کہا کہ میں حرام وحلال کی زبان عام طور پر استعمال نہیں کرتا۔ میں سادہ زبان میں صرف یہ کہوں گا کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ضرورت پر قناعت کرے۔ اگر ایسا کرنا مشکل ہو تو رعایت کے درجہ میں راحت والی چیزوں کو بھی استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر عیش و عشرت والی زندگی میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ محمد عمران صاحب بھوپال کے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں ان کو سائنس کے موضوع سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے چند باتیں کہیں۔ میں نے کہا کہ سائنسی انداز میں سوچنا بہت اچھی بات ہے مگر سائنسی سوچ کو مفید

بنانے کے لئے ایک حقیقت کا لحاظ کرنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ سائنس صرف جزئی علم دیتی ہے اس لئے سائنس کے ذریعہ اسلام کا کلی علم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے مزید کہا کہ کچھ لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ تمام سائنسی علوم کو قرآن سے نکالیں۔ یہ ایک طفلانہ بات ہے قرآن معرفت حق کی کتاب ہے نہ کہ سائنس کی کتاب۔ ہمیں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرنا چاہئے کہ قرآن چودہ سو سال پہلے اترا جب کہ جدید سائنسی معلومات دریافت نہیں ہوئی تھیں اس کے باوجود قرآن کی کوئی بات سائنسی طور پر غلط ثابت نہیں ہوئی۔ قرآن نے اپنا پیغام دیتے ہوئے مختلف علوم کے حوالے دیئے ہیں مگر قرآن کا کوئی بیان جدید سائنس کی کسی دریافت سے نہیں ٹکراتا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن علیم و خبیر ہستی کی کتاب ہے۔ گویا اصل بات یہ نہیں ہے کہ قرآن میں سائنس کے تمام مضامین موجود ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ قرآن میں اور جدید سائنس میں کوئی ٹکراؤ نہیں اور ہمارے مقصد کے لئے یہی بات کافی ہے۔

یکم اکتوبر کی شام کو ملاّ رموزی سنسکرتی بھون کے ہال میں گاندھی سمیتی کے تحت پروگرام ہوا جس میں مختلف لوگ شریک تھے۔ اس کا موضوع تھا ملٹی کلچر اینڈ گاندھی۔ میں نے اس موضوع پر تقریباً آدھا گھنٹہ تقریر کی۔ میری تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ملٹی کلچر اور یونی کلچر کا معاملہ ہمارے انتخاب کا معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یونی کلچر صرف ایک خیالی نظریہ ہے، اس دنیا میں وہ قابل عمل ہی نہیں۔ کلچر اپنی عین نوعیت ہی کے لحاظ سے ملٹی کلچر ہے اور ہمارے لئے کامیابی کا راز یہ ہے کہ ہم اس کو کسی بحث کے بغیر قبول کر لیں۔

مسٹر کلدیپ نیر نے اپنی تقریر میں مہاتما گاندھی کے دو قصے بیان کئے جو یہاں قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگست ۱۹۴۷ کے ہنگامہ کے بعد پاکستان سے آنے والا ایک ہندو مہاتما گاندھی سے ملا اس نے کہا کہ میرے بارہ سال کے لڑکے کو مسلمانوں نے مار ڈالا اب مجھ کو آپ

کیا مشورہ دیتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ دیکھو یہ بہت سے مسلمان یتیم بچے ہیں تم ان میں سے بارہ سال کی عمر کے کسی بچہ کو لے لو اور مسلمان کی طرح اس کی پرورش کرو۔ اس آدمی نے ایسا ہی کیا۔

دوسرا واقعہ انھوں نے یہ بتایا کہ دہلی کے برلا مندر میں ہر روز صبح کو مہاتما گاندھی کی پرارتھنا ہوتی تھی جس میں ہر مذہب کی مقدس کتاب کا کچھ حصہ پڑھا جاتا تھا۔ ایک دن مہاتما گاندھی نے مجمع سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو اس پروگرام پر اعتراض تو نہیں۔ ایک ہندو نے کہا کہ مجھے اعتراض ہے میں پاکستان سے بھاگ کر آیا ہوں اور میں نے دیکھا کہ وہاں قرآن کے ماننے والوں نے کتنا ظلم کیا ہے۔ گاندھی جی نے کوئی جواب نہیں دیا صرف اس دن کی پراتھنا بند کر دی۔ اگلے دن دوبارہ انھوں نے یہی سوال کیا اب بھی وہ ہندو وہاں موجود تھا اس نے کہا کہ اب مجھ کو کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد قرآن سمیت تمام کتابیں پڑھی گئیں —— یہ تھا خاموشی کی طاقت کا کرشمہ۔

یکم اکتوبر کی شام کو ایک ہندو مقرر نے بتایا کہ سوامی وویکانند سے ایک شخص نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی وویکانند بن جاؤں۔ جواب میں سوامی وویکانند نے کہا کہ آپ ایک منٹ میں سوامی وویکانند بن سکتے ہیں مگر سوامی وویکانند ہونے کے لئے ایک صدی چاہئے:

محمد ذاکر حسین کے صاحبزادہ محمد زبیر کی عمر ابھی صرف آٹھ سال ہے اور انھوں نے آدھا قرآن حفظ کر لیا ہے۔ میں نے صاحبزادہ سے کہا کہ آپ قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنائیں انھوں نے سبحان الذی اسری بعبدہ سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کے پڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی پختہ قاری پڑھ رہا ہو۔ ان کو سن کر میں نے کہا کہ یہ بھی قرآن کا ایک زندہ معجزہ ہے کہ ۸ سال کا ایک بچہ ۱۵ پارہ حفظ کر لے اور اس کو ایک پختہ قاری کی طرح پڑھ کر سنائے معلوم ہوا کہ انھوں نے صرف دیڑھ سال میں یہ حفظ کیا ہے۔

مذکورہ بچہ کے استاد حافظ عبد الرقیب صاحب ہیں وہ اپنے بزنس کے سلسلہ میں ہر روز بھوپال سے بیر کھیڑی جاتے ہیں۔ ۳۲ کلو میٹر کا یہ فاصلہ بس کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔ بس کے مالک غیر مسلم ہیں مگر جب انھوں نے جانا کہ یہ بچہ اپنے استاد کے ساتھ حفظ قرآن کے لئے روزانہ سفر کرتا ہے تو انھوں نے بچہ کا کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یہ بچہ ہر روز ۶۴ کلو میٹر کا یہ سفر بس کے ذریعہ طے کرتا ہے مگر بس کے مالکان اس کا کرایہ نہیں لیتے۔ یہ قصہ سن کر میں نے کہا کہ یہ بھی قرآن کی ایک کرامت ہے۔

یکم اکتوبر کی شام کا کھانا محمد ذاکر صاحب کے مکان پر طے تھا مگر راستہ کی بھیڑ کی وجہ سے وہ کھانا لے کر ہوٹل میں آگئے۔ چنانچہ تقریباً ۲۰ آدمیوں کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا گیا۔ میں نے محمد ذاکر صاحب سے کہا کہ یہ تو آپ نے میرے اوپر بہت بڑا ظلم کیا۔ انھوں نے کہا کہ دسہرہ کی وجہ سے آج راستہ میں بہت بھیڑ تھی اور ہوٹل سے میرے گھر تک جانے میں آپ کو زحمت ہوتی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ وہاں سے یہاں آسکتے تھے تو میں بھی یہاں سے وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔

مولانا محمد اختر قاسمی نے کہا کہ عمل کا رد عمل تو ایک فطری چیز ہے پھر آپ کیوں کہتے ہیں کہ جب دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جائے تو مسلمانوں کو مشتعل نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ رد عمل بلا شبہ ایک فطری چیز ہے مگر یہ فطرت برائے اظہار نہیں ہے بلکہ برائے امتحان ہے۔ یعنی انسان کے اندر یہ مزاج اس لئے نہیں رکھا گیا ہے کے لوگ ہر خلاف مزاج بات پر لڑ جائیں اور انتقامی کارروائیاں کریں بلکہ وہ اس لئے ہے کہ لوگ اس اعلیٰ انسانی صفت کی تربیت حاصل کریں جس کو ضبط و تحمل کہا جاتا ہے غصہ دلانے پر غصہ ہو جانا ایک حیوانی صفت ہے اور غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہونا ایک انسانی صفت۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ دنیا میں اس اعلیٰ انسانی صفت کا ثبوت دے تا کہ ان کا شمار اللہ کے یہاں صالحین میں کیا جائے۔

مولانا شمس الدین ندوی نے کہا کہ ایک حدیث یہ بتاتی ہے کہ ”من استغضب ولم یغضب فهو حمار“ (جس آدمی کو غصہ دلایا جائے مگر وہ غصہ نہ ہو تو وہ گدھا ہے) انھوں نے کہا

کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کے غصہ دلانے پر غصہ ہونا کوئی بری بات نہیں بلکہ وہ اچھی بات ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات بذات خود صحیح ہے، کیوں کہ غصہ عام طور پر الفاظ پر آتا ہے۔ آپ کسی کو کوئی سخت لفظ بول دیں تو وہ غضبناک ہو جائیگا، اس قسم کا غصہ صرف انسان کو ۸
آسکتا ہے کیوں کہ یہ صرف انسان ہی ہے جو الفاظ کی زبان جانتا ہے۔ گدھے کے سامنے آپ سب وشتم کے تمام الفاظ دہرادیں تب بھی اسے غصہ نہیں آئے گا۔ کیوں کہ اس نے آپ کے الفاظ کا کوئی مطلب سمجھا ہی نہیں۔

میں نے کہا کہ غصہ ہونا بلاشبہ کسی کے حیوان ناطق ہونے کا ثبوت ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسروں کو اپنے غصہ کا شکار بنانا بھی کوئی انسانی فعل ہے۔ اس قول کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب تم کو غصہ دلایا جائے تو تم کو غصہ ضرور آئے گا۔ کیوں کہ تم انسان ہو مگر انسان ہونے ہی کا دوسرا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہمارے اندر تحمل کی صفت ہو۔ تم غصہ کے باوجود اس آیت کا مصداق بنو کہ "واذاما غضبوا هم يغفرون"

غصہ آنا ایک چیز ہے اور غصہ کو ظاہر کرنا دوسری چیز۔ غصہ آنا بلاشبہ ایک فطری صفت ہے مگر غصہ کو ظاہر کرنا بلاشبہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔ غصہ آنا اگر اس بات کی پہچان ہے کہ آپ ایک انسان ہیں، تو غصہ کو ظاہر کرنا اور فریق ثانی کو اپنے غصہ کا نشانہ بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کے امتحان میں ناکام ہو گئے۔

یہ سن کر ایک صاحب نے کہا کہ غصہ کو روکنا تو بہت مشکل کام ہے۔ میں نے کہا کہ یہی مشکل تو جنت کی قیمت ہے۔ اور کسی اعلیٰ چیز کی قیمت ہمیشہ مشکل ہی ہوتی ہے۔ اگر غصہ کے وقت آدمی یہ سوچے کہ یہ تو میرے لئے جنت کی قیمت ادا کرنے کا وقت ہے تو حضرت عمر فاروق کے الفاظ میں غصہ کو پی جانا اس کے لئے سب سے زیادہ میٹھا گھونٹ بن جائے۔

۲ اکتوبر کی صبح کو جناب الطاف حسین صدیقی کے مکان پر صبح کے ناشتہ کا پروگرام تھا،

یہاں اور کئی لوگ موجود تھے، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ بھائی الطاف صاحب معاشیات سے خصوصی دل چسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندستان کی اقتصادیات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہماری ضرورت فارن انوسٹمنٹ ہے۔ ہماری ضرورت فارن لون نہیں۔ ہندستان میں آزادی کے بعد بہت بڑی مقدار میں بیرونی قرضے لئے گئے مگر ان قرضوں کا کوئی مثبت اقتصادی فائدہ اس ملک کو نہ ملا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرض سے پہلے یہ مسئلہ ہے کہ قرض کی رقم کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے کیا ہمارے پاس صلاحیت موجود ہے۔ چونکہ یہ صلاحیت موجود نہیں تھی اس لئے ان قرضوں کا حال وہی ہوا کہ کسی کو دودھ دیا جائے مگر اس کو لینے کے لئے اس کے پاس صرف چھلنی موجود ہو، ایسا آدمی دودھ کے عطیہ کے باوجود دودھ سے محروم رہے گا۔

فارن انوسٹمنٹ میں یہ خطرہ نہیں تھا وہ لوگ اپنے مالیاتی انوسٹمنٹ کے ساتھ اپنی صلاحیت بھی لے آتے اور پھر ان کا اقتصادی فائدہ بھی ضرور ملک کو ملتا۔ آزادی کے چالیس سال بعد لبرلائزیشن کے تحت فارن انوسٹمنٹ کا دروازہ کھولا گیا مگر عملاً وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ ہمارے ملک کی دو بنیادی خرابیاں تھیں جو نہرو کی پالیسیوں کی دین ہیں یہ ہے قانون قاعدوں کی بھرمار اور کرپشن۔ اس دگنا رکاوٹ کی بنا پر بیرونی کمپنیاں اس طرح ہندستان میں نہ آسکیں جس طرح وہ دوسرے ملکوں میں جا کر اپنا کام کر رہی ہیں۔

بیرونی ملکوں میں ہندستان کے جو لاکھوں لوگ ہیں جن کو نان ریزیڈینٹ انڈین کہا جاتا ہے وہ اس معاملہ میں بہت بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں جناب محمد مبین انجینر نے بتایا کہ ان ہندستانیوں کے پاس تین سو پچاس بلین ڈالر کا ریزرو ہے۔ اگر یہ رقم انڈیا میں آجائے تو ہمارا سارا اقتصادی مسئلہ حل ہو جائے۔

میں نے اپنے بیرونی سفروں کے درمیان بہت سے ایسے ہندستانیوں سے ملاقات کی ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ ہندستان میں اپنا سرمایہ کیوں نہیں لگاتے۔ تقریباً ہر ایک نے

کہا کہ ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں مگر ہندستان کا کرپشن اور بڑھتی ہوئی بیوراکریسی کی بنا پر ہماری ہمت نہیں پڑتی۔

موجودہ گورمنٹ نے بیرونی ملک میں آباد ہندستانیوں سے اپیل کی کہ وہ ہندستان میں اپنا پیسہ لگائیں۔ اس سلسلہ میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا نے خصوصی رعایتوں کا اعلان کیا۔ اس کے بعد غیر مقیم ہندستانیوں نے چار بلین ڈالر سے زیادہ اسٹیٹ بنک آف انڈیا کو دئے۔ اس سلسلہ میں جناب محمد مبین شاغل (۳۸ سال) نے یہ پر مسرت بات بتائی کہ اس رقم کا 65% حصہ خلیجی ملکوں میں مقیم ہندستانی مسلمانوں کی طرف سے آیا ہے۔ اس کی تفصیلی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا میں چھپی ہے۔ یہ بلاشبہ اس الزام کی ایک تردید ہے کہ مسلمان اس ملک کے وفادار نہیں کیوں کہ انسان کے لئے سب سے مشکل چیز "زر" کو دینا ہے جیسا کہ فارسی کے ایک مقولہ میں کہا گیا ہے کہ "زرمی طلبی سخن دریں است" اس نازک اقتصادی موقع پر جب مسلمانوں نے دوسرے فرقوں سے بڑھ کر ملک کے لئے اپنی مالی امداد پیش کر دی تو یہ گویا اس بات کا آخری ثبوت ہے کہ وہ اس ملک کے سچے دیش بھکت ہیں بلکہ شاید دوسروں سے زیادہ۔

مولانا اقبال احمد سہیل (وفات) نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے اپنے ایک شعر میں کہا تھا کہ

جان جائے پر نہ جائے حرمت شان وطن

میں اس میں معمولی لفظی فرق کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ

مال جائے پر نہ جائے حرمت شان وطن

۲ اکتوبر کو ۱۱ بجے ہم لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے ایک پلاٹ لیا ہے اور وہاں وہ اپنا مکان بنانا چاہتے ہیں۔ مجھ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ میں اس تعمیر ہونے والے مکان کا سنگ بنیاد رکھوں جو انشاء اللہ نہ صرف ڈاکٹر حمید اللہ ندوی کے لئے ایک رہائش گاہ

ہو گا بلکہ وہ اسی کے ساتھ الرسالہ مشن کا ایک خداداد مرکز بھی بنے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ یہ سنگ بنیاد جناب ذاکر الرحمٰن عرف مہتاب میاں کی موجودگی میں رکھا گیا۔

یہ پلاٹ بھائی الطاف صاحب (پروجکٹ کنسلٹینٹ) کی رہائش گاہ کے قریب ہے اور انھیں کے مشورہ اور کوششوں کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔ بھائی الطاف صاحب نے کہا کہ ایک سال پہلے وہ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی کے ساتھ یہاں آئے۔ بھائی الطاف صاحب (پیدائش ۱۹۳۴) تقریباً ۳۴ سال سے ریٹناڈی جنریشن کی وجہ سے دونوں آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پلاٹ کو دیکھنے کے لئے آئے تو انھوں نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ مجھے بصارت حاصل نہیں مگر میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ یہ مقام انشاءاللہ انتہائی پر رونق اور خیر و برکت والا ہے۔ یہ سن کر مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آیا۔ وہ دونوں آنکھوں سے نابینا تھے۔ انھوں نے ایک نعتیہ نظم لکھی اس نعتیہ نظم کا ایک شعر یہ تھا:

بصارت کھو گئی تو کیا بصیرت تو سلامت ہے — مدینہ ہم نے دیکھا ہے مگر نادیدہ نادیدہ

۲ اکتوبر کی دوپہر کو بھوپال کا ایک رفاہی ادارہ دیکھا۔ اس کا نام شبھم وکلانگ سیوا سمیتی ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۸۰ میں جناب سردار خانصاحب کی صدارت میں قائم ہوا جس کے سرپرست جناب الطاف صدیقی صاحب ہیں۔ میں نے ان بچوں کو دیکھا جن کی تعداد ۶۳ ہے ان میں ہندو اور مسلمان دونوں بچے شامل ہیں۔ میں نے کئی بچوں سے بات کی دو بچوں سے ہونے والی بات کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سنتوش چورسیہ (عمر ۱۴ سال) ان سے میں نے پوچھا کہ آپ یہاں کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پڑھتے ہیں۔ میں نے پھر پوچھا کہ آپ کیا سوچتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ پڑھ لکھ کر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوں گا۔ ایک اور بچہ جس نے اپنا نام شنکر شرما (عمر ۱۲ سال) بتایا۔

وہ بھی اپنے دونوں پیروں سے معذور تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پڑھنے کے بعد کیا کریں گے ۔اس نے جواب دیا میں پڑھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ یہ بات وہ بچے کہہ رہے تھے جو اپنے دونوں پیروں سے پوری طرح معذور تھے اور جسمانی طور پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ علم میں کیسی عجیب طاقت ہے۔ علم آدمی کو اس حد تک باشعور بناتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور پر اتنا طاقتور ہو جائے کہ اس کی جسمانی کمزوری ترقی کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔

اس ادارہ میں اس وقت ۶۳ معذور بچے ہیں ان میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ ان کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ ان کے مقابلہ میں مجھے اپنا وجود حقیر نظر آنے لگا۔ میں نے سوچا کہ میرا معاملہ تو ایک مشتبہ معاملہ ہے مگر یہ بچے یقینی طور پر خدا کی ایک مرضی کو پورا کر رہے ہیں۔ وہ دنیا میں خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے نشان راہ (sign post) ہیں۔ وہ زندہ زبان میں لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ اے لوگو، اگر خدا نے تم کو ہاتھ اور پاؤں آنکھ اور دماغ سے معذور نہیں بنایا تو اس پر ناز نہ کرو بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کیونکہ خدا اگر چاہتا تو وہ تم کو بھی ویسا ہی بنا دیتا جیسا کہ تم ہم کو دیکھ رہے ہو۔ اس ادارہ کا ڈاک کا پتہ یہ ہے۔

Subham Viklang Awam Samaj Sewa Samiti
Near Kausar Masjid, Cheklad Road.
Jehangirabad, Bhopal - 462008
Tel-(0755)511957-770482

۲ اکتوبر ۹۸ کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز بھوپال کی صوفیہ مسجد میں پڑھی یہ مسجد مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے کئی بار یہاں نماز پڑھی ہے۔ مسجد اس طرح بنائی گئی ہے جیسے کہ وہ پارک کے اندر ہو۔ قدرتی مناظر کے درمیان عبادت گاہ کا تصور میرے جیسے آدمی کے لئے بہت

پر کشش ثابت ہوتا ہے۔

آج دوپہر کے کھانے کا انتظام اسی مسجد میں کیا گیا تھا۔ تقریباً ۱۰۰ آدمی کھانے پر موجود تھے۔ ان میں مدھیہ پردیش کی مشہور شخصیت مسٹر کنک تیواری بھی تھے۔ مسٹر کنک تیواری اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اسی کے ساتھ وہ گاندھی وادی بھی ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کے کئی قصے سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ گاندھی جی مدھیہ پردیش میں دس بار اور بھوپال میں دو بار آئے تھے۔ ان کا پہلا سفر غالباً ۱۹۲۰ میں مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ہوا تھا جب کہ وہ چھندواڑا گئے تھے۔

بھوپال کے اس سفر میں بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں میری اول دن سے ایک ہی رائے ہے۔ عام طور پر مسلمانوں کے رہنما خواہ بے ریش ہوں یا باریش سب ایک ہی بات کہتے ہیں وہ یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہاں کے اکثریتی فرقہ کا تعصب ہے۔ میں اس کو بالکل بے معنی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی بے شعوری ہے۔ یہ مسئلہ انڈیا میں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ پاکستان میں۔

صوفیہ مسجد میں کچھ مسلمانوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آزادی کے بعد ہندستان اور پاکستان دونوں یکساں طور پر مسائل کا شکار بنے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد دونوں ملکوں میں جو رہنما اٹھے انھوں نے صحیح نقطۂ آغاز سے اپنا کام شروع نہیں کیا۔

پاکستان میں وہاں کے مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھا کے یہاں کرنے کا پہلا کام اسلامائزیشن آف اسٹیٹ ہے۔ حالانکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہاں مسلمانوں کے مختلف طبقات میں وہ شعور پیدا کیا جائے جو انھیں مل کر رہنا سکھائے اور باہمی ٹکراؤ کا خاتمہ کرے۔ اس غلط آغاز کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامائزیشن کے نام پر کوششوں کا طوفان کھڑا کر دیا گیا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ جو پاکستان ایک قوم کے نام پر بنا تھا وہ کئی قوموں اور فرقوں میں بٹ کر آپس میں تباہ کن لڑائی میں مشغول ہو گیا۔

ہندستان کے مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھا کہ یہاں کی مفروضہ مسلم دشمن طاقتوں کے خلاف مفروضہ لڑائی لڑتے رہیں۔ اس نام نہاد لڑائی کا بے نتیجہ ہو جانا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ معاملہ کے صحیح تشخیص پر قائم نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم نقطۂ نظر سے ہندستان کا اصل مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو نارمل بنانا تھا۔ اسی نارملائزیشن پر مسلمانوں کی تمام ترقیوں کا انحصار تھا، دینی بھی اور دنیوی بھی۔

صوفیہ مسجد میں کچھ مسلمانوں نے فخر کے ساتھ یہ کہا کہ بھوپال میں اور (اسی طرح سارے ہندستان میں) مسجدوں میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے اور نمازیوں کی تعداد بھی ہر جگہ بہت بڑھ رہی ہے۔

میں نے کہا کہ میں چیزوں کو ان کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں دیکھتا ہوں بلکہ ان کی حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہوں۔ اس لئے اس مذہب میں میرے لئے کوئی زیادہ خوشی کی بات نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ نماز یا مسجد کو جانچنے کا اسلامی معیار کیا ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق، وہ تقویٰ ہے۔ مسجدوں میں نمازیوں کا اضافہ اگر مسلمانوں میں اسلامی کیرکٹر پیدا کر رہا ہو تو بلا شبہ یہ خوشی کی بات ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ میرا تجربہ ہے اور آپ بھی یقیناً جانتے ہوں گے کہ نماز کی کثرت کے باوجود مسلمانوں سے وعدہ خلافی ختم نہیں ہوئی۔ پیسے کے لین دین میں وہ مضبوط نہیں بنے۔ مسلمانوں میں یہ مزاج نہیں آیا کہ کسی کے بارے میں کوئی الٹی بات سنے تو تحقیق کے بغیر اس کو نہ مانے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ فحشا منکر سے بچنے والے نہیں بنے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے میں یہاں صرف ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔ حدیث میں آیا ہے کہ کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ جو سنے اس کو دہرانے لگے (كفى بالمرء كذباً ان يحدث بكل ما سمع)

میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ موجودہ مسلم سماج میں بہت کم افراد ہوں گے جو اس معیار پر پورے اتریں۔ میں ذاتی طور پر اس معاملہ کا ثبوت ہوں۔ میرے معاملہ میں بہت سی باتیں کچھ لوگوں نے بے بنیاد طور پر کہیں۔ مثلاً یہ کہ میں بی جے پی کا ایجنٹ ہوں، مجھ کو مسلم دشمن طاقتوں سے پیسہ ملتا ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان بابری مسجد ہندوؤں کو دے دیں، میرے ماہنامہ رسالہ کا بل ہندو ادا کرتے ہیں، مجھ کو اسلام کے دشمنوں نے ڈیپوٹ کیا ہے کہ میں مسلمانوں کو اندر سے کمزور کروں وغیرہ وغیرہ۔

میرے خلاف اس قسم کی باتیں اردو اخباروں اور رسالوں میں چھپتی ہیں۔ سارے ہندستان کے مسلمان ان باتوں کو دہراتے ہیں۔ مگر آج تک کسی بھی شخص نے مجھ سے ٹیلی فون یا خط یا ملاقات کے ذریعہ یہ نہیں پوچھا کہ آپ کے بارے میں فلاں بات ہم نے سنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ سے تحقیق کرلوں اس کے بعد اس پر لکھوں یا بولوں۔

اس طرح کے کثیر تجربات کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے شاید کوئی اسلامی ظاہرہ (Islamic phenomenon) نہیں بلکہ وہ ایک قسم کی فراریت ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں غیر مسلموں کے براہ راست مقابلہ سے ہر میدان میں اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں پاتے ہیں۔ یہ مسجدیں مسلمانوں کو ایک طرف حفاظت خانہ (safe haven) فراہم کرتی ہیں اور دوسری طرف یہاں کے علیحدہ ماحول میں ان کو یہ موقع ملتا ہے کہ اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف اس قسم کی بددعائیں کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں "اللهم اهلكهم ، اللهم دمر ديارهم ، اللهم خذهم اخذ عزيز مقتدر" ایک صاحب نے کہا کہ اس قسم کی بددعائیں تو ماثور ہیں اور روایات سے ثابت ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات درست نہیں اس لئے کہ بعض بددعائیں جو روایات میں آئی ہیں وہ صرف وقتی تھیں اور وہ بھی صرف اس وقت کی گئیں جب کہ

فریق ثانی پر اتمام حجت آخری حد تک کیا جا چکا تھا۔اس کے باوجود اس نے ظالمانہ جارحیت کا طریقہ اختیار کیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان ''اہل کفر'' کے خلاف ہر روز بددعائیں کرتے ہیں ان میں یہ دونوں شرطیں نہیں پائی جاتیں۔ اس لئے یہ بددعائیں یقینی طور پر سنت کے مطابق نہیں ہیں، بلکہ وہ ان احادیث کے مصداق ہیں جن میں کہا گیا کہ تم دعائیں مانگو گے اور تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی (ولا یستجاب لکم)

بھوپال میں موتی مسجد (سے متصل) کے پاس مکتبہ الرسالہ قائم کیا گیا ہے۔ جناب انور جمال صاحب نے اپنے مکان کا ایک حصہ جو سڑک کی طرف کھلتا ہے اس کے لئے خاص کیا ہے اور بطور عطیہ مکتبہ الرسالہ کو دیا ہے۔ ۲ اکتوبر کو میں نے اس مکتبہ کا افتتاح کیا۔

۲ اکتوبر کی شام کو اچاریہ نریندر دیو لائبریری کے ہال میں ایک پروگرام ہوا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ شریک ہوئے۔ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے اس کا موضوع تھا ''اسلام اور آتنکواد'' میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اسلام میں آتنک واد کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بحیثیت فرد ایک مسلمان کو صبر اور اعراض کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں تک جنگ کا تعلق ہے تو اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے، اقدامی جنگ یا ہجومی لڑائی اسلام میں سرے سے جائز ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ جنگ اسٹیٹ کا معاملہ ہے نہ کہ غیر حکومتی افراد یا گروہ کا معاملہ۔ موجودہ زمانہ میں مختلف ملکوں میں مسلمانوں کے غیر حکومتی گروہوں نے وہاں کی حکومت کے خلاف جو لڑائیاں چھیڑ رکھی ہین وہ بلا شبہ اسلام میں ناجائز ہیں۔ ایک مسلمان ذاتی فیصلہ کے تحت روزہ نماز کر سکتا ہے مگر غیر حکومتی افراد خود اپنے ارادہ یا فیصلہ کے تحت کسی حکومت کے خلاف متشددانہ جنگ نہیں چھیڑ سکتے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ یقینی طور پر سخت گناہ گار ہیں۔

جناب کیلاش نارائن سارنگ کے ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ قرآن میں قتال کی جو آیتیں ہیں وہ پیغمبر کے ہم عصر حملہ آوروں سے لڑنے کے لئے ہیں۔ مثلاً قاتلِ

المشرکین کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی مشرک ہو اس سے لڑو، بلکہ اس سے مراد مکہ کہ وہ ہم زمانہ مشرکین ہیں جنھوں نے یک طرفہ طور پر پیغمبر کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی اور کسی طرح اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان جارحین کے خلاف دفاعی طور پر جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ میں نے کہا کہ کرشن جی گیتا میں ارجن سے کہتے ہیں کہ تم یدھ (جنگ) کرو مگر یہ کوئی مطلق یا عمومی بات نہیں تھی۔ یعنی اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہندو ہر زمانہ میں ہر قوم سے لڑتے رہیں۔ یہ صرف ایک وقتی حکم تھا اسی طرح قرآن میں قتال کا حکم وقتی حکم ہے نہ کہ کوئی مطلق یا عمومی حکم۔

۲ اکتوبر ۹۸ کو ہوٹل نور الصباح میں شام کی چائے کا پروگرام تھا۔ میں کئی لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ یہ ایک نیا ہوٹل ہے جو بھوپال کا پہلا فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ وہ نواب بھوپال کے ایک محل کو از سر نو مزین کر کے بنایا گیا ہے۔ یہاں ہم نے مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔ جس کمرہ میں نماز ادا کی گئی وہ اس ہوٹل کا اعلیٰ ترین سوئٹ تھا جس کا روزانہ کا کرایہ ساڑھے گیارہ ہزار روپیہ ہے۔ اس ہوٹل کے مالک مسلمان ہیں۔

ہوٹل کے مینجر مسٹر انوراگ پاٹھک (۲۶ سال) نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ہوٹل کے مختلف حصے دکھائے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے باپ ایک مسلمان صوفی سے بہت متاثر ہیں۔ باپ کے اثر سے میں بھی اسلام سے بہت قریب ہوں۔

جناب عبد الوحید خاں صاحب (بھوپال یونیورسٹی) سے میں نے پوچھا کہ آپ اپنی زندگی کا کوئی انوبھو بتایئے۔ انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو ہر انسان کے لئے اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری عادت ہے کہ جب میں کسی کے خلاف کوئی بری بات سنتا ہوں تو اس کو ماننے سے پہلے اس کی تحقیق کرتا ہوں۔ جب تک تحقیق سے بات ثابت نہ ہو جائے میں اس کو نہیں مانتا اور نہ اس کا چرچا کرتا ہوں۔ بطور مثال انھوں نے کہا کہ الرسالہ مشن کے بارے میں

میں نے بہت سی نامناسب باتیں سنیں مگر میں نے ایسا نہیں کیا کہ میں ان کو فوراً مان لوں بلکہ میں نے اس کی باقاعدہ تحقیق شروع کر دی آخر کار تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سب بے بنیاد الزامات تھے۔

۲ اکتوبر کی شام کو ملار موزی سنسکرتی بھون میں آخری اجتماع تھا۔ مدھیہ پردیش کے گورنر ڈاکٹر بھائی مہادیر اور دوسرے کئی لوگ موجود تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ امن کی طاقت تشدد کی طاقت سے زیادہ ہے۔ اس معاملہ کو مختلف مثالوں سے واضح کیا۔

۲ اکتوبر کو رات کے کھانے کا انتظام عبدالوحید خاں صاحب کی طرف سے تھا۔ وہ کھانا لے کر ڈاکٹر حمید اللہ ندوی کے مکان پر آگئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہیں کھانا کھایا اس کے بعد دیر تک لوگوں سے بات چیت ہوتی رہی۔

ایک خاتون جو الرسالہ کی قاری ہیں انھوں نے کہا کہ مجھے طرح طرح کے اندیشے آتے ہیں جن کی وجہ سے میں پریشان رہتی ہوں۔ میں نے انھیں ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ کر دیا۔ اندیشوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بیشتر اندیشے کبھی واقعہ نہیں بنتے۔

۳ اکتوبر ۱۹۹۸ کی صبح کو بھوپال سے واپسی ہوئی۔ ساتھیوں کے ہمراہ ہوٹل سے چل کر بھوپال ائرپورٹ پہنچا۔ یہاں بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

جناب محمد ذاکر صاحب اور جناب محمد مبین صاحب نے مشترک طور پر یہ بات بتائی کہ آج کل ایک نیا کاروبار ہر جگہ زوروں پر ہو رہا ہے۔ پرائیوٹ طور پر مالی ادارے بنائے جاتے ہیں جن کو نان بینکنگ فائننشیل انسٹیٹوٹ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بڑے بڑے خوشنما وعدوں پر لوگوں سے رقمیں حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ ہمیں ایک لاکھ روپیہ دیں ہم آپ کو ۳۶ ہزار روپئے سالانہ بطور نفع دیتے رہیں گے وغیرہ۔ اس طرح ان لوگوں کے پاس تھوڑی مدت میں اربوں روپئے جمع ہو جاتے ہیں۔

چند سال یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اس کے بعد کمپنی اچانک مارکیٹ سے اس طرح غائب

ہو جاتی ہے جیسے کوئی ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو کر ائرپورٹ کنٹرول کی اسکرین سے اچانک غائب ہو جائے۔ اس کے بعد رقمیں جمع کرنے والے لوگ بے یارومددگار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ملکی قوانین کے تحت ایسے لوگوں کی کوئی پکڑ نہیں کیوں کہ ان کا نظام ریزرو بینک آف انڈیا سے آزاد رہتا ہے، اس لئے ریزرو بینک ان کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔

اب دوسرا اجارۂ کار یہ ہے کہ شکار ہونے والے افراد عدالت میں جائیں مگر اس معاملہ میں موجودہ قانونی صورت حال یہ ہے کہ اس طرح کا مالی فراڈ کرمنل کیس نہیں بنتا۔ وہ صرف سول کیس بنتا ہے۔ چنانچہ عدالتیں یہ نہیں کرپاتیں کہ وہ ایسی کمپنیوں کو رقم کی ادائیگی پر مجبور کریں وہ صرف چند سال کی سزا دے سکتی ہیں اور اربوں روپیے کمانے والے ان افراد کے لئے اس قسم کی جیل یاترا ایک تفریحی آؤٹنگ سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جناب عبد الوحید خاں صاحب ایڈوکیٹ اور کچھ دوسرے صاحبان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کامیاب منصوبہ بندی نام ہے داخلی خواہشوں اور خارجی عوامل کے درمیان مطابقت دریافت کرنے کا۔ میرا تجربہ ہے کہ بیشتر لوگ صرف اپنی خواہشوں کو جانتے ہیں چنانچہ جو خواہش بھی ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں حالانکہ جس دنیا میں انھیں اپنی خواہش کو پورا کرنا ہے اس میں دوسرے بہت سے افراد ہیں اور دوسرے بہت سے عوامل کام کر رہے ہیں ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص یک طرفہ طور پر اپنی خواہش کو پورا کرسکے۔

یہ گفتگو ۳ اکتوبر کی صبح کو بھوپال ائرپورٹ پر ہوئی، جہاں یہ لوگ اور دوسرے بہت سے افراد مجھے الوداع کہنے کے لئے آئے تھے۔ ائرپورٹ پر بعض احباب نے کہا کہ ہم کچھ گھریلو مسائل میں دوچار ہیں ہمیں کوئی دعا بتایئے میں نے ان کو یہ دعا لکھ کر دی۔ **اللھم اصلح لی شانی کلہ دقہ وجلہ یاخیر الرازقین یا ارحم الراحمین**

اس قیام کے دوران بار بار بھوپال شہر کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نظم اور صفائی وغیرہ کے اعتبار سے بھوپال کی حالت بھی وہی ہے جو ہندستان کے دوسرے شہروں کی ہے۔ سڑکوں پر

بے ترتیب گاڑیوں کا ہجوم، فضا میں کثافت، سڑک کے دونوں طرف غیر صاف فٹ پاتھ، جگہ جگہ لاؤڈ سپیکروں کا شور، غیر قانونی تعمیرات، وغیرہ۔ ۱۹۴۷ کے بعد ملک میں جو حکومتیں بنیں، ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتی رہی کہ وہ ملک کی ترقی کے لئے بڑے بڑے کام کر رہی ہے۔ مگر یہ ترقیاں آج بھی صرف کاغذ پر دکھائی دیتی ہیں، شہروں اور بستیوں میں وہ کہیں نظر نہیں آتیں۔ جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر ایک ہندو تاجر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنا نام چھوٹا لال (۸۲ سال) بتایا۔ وہ گاندھی جی کے وطن پوربندر میں پیدا ہوئے۔ اب بزنس کے تحت کلکتہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کو دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں۔ انہوں نے سخت لہجہ میں ہندستان کی سیاست پر تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کہتے تھے کہ دیش کو آزاد کر کے ہم اپنے یہاں رام راجیہ بنائیں گے۔ مگر آج رام راجیہ کہاں ہے۔ یہ تو راون راجیہ ہے۔ یہ دیش اچھے لوگوں کے رہنے کے لئے نہیں۔ یہ چوروں اور لٹیروں کے لئے ہے۔ لوگ صرف گاندھی کا نام لیتے ہیں گاندھی کو ماننا کوئی بھی نہیں۔

مسٹر چھوٹا لال نے دنیا کے اکثر ملکوں کو دیکھا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ جن ملکوں میں گئے ان میں سے کون سا ملک آپ کو زیادہ پسند آیا۔ انھوں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا، سلازار (۱۹۷۰) (Antoniode Oliveira Salazar) کا ملک پرتگال۔ سلازار پرتگال میں ۳۶ سال تک وزیر اعظم رہا۔ اس کو ایک عامر حکمراں کہا جاتا ہے۔ مگر وہ ایک نہات بااصول آدمی تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی گزارتا تھا۔ وہ پبلیسٹی سے دور رہتا تھا۔ اسٹیج کی تقریر سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ۱۹۳۲ میں جب اس کو پرتگال کا سیاسی اقتدار ملا اس وقت یہ ملک زبردست انتشار کا شکار تھا مگر سلازار کی سیاسی قیادت کے تحت اس کو نئی زندگی مل گئی۔

بھوپال سے دہلی کے لئے انڈین ایر لائنس کی فلائٹ ۴۳۴ کے ذریعہ واپسی ہوئی۔ جہاز تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو کر ساڑھے بارہ بجے دلی پہنچا۔ ہندستان میں ہوائی جہاز کی سطح پر بھی اوقات کی پابندی موجود نہیں۔ پھر ریلوں اور بسوں کے سفر میں اگر اوقات کی پابندی نہ ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

شیطانی وسوسہ

ایک آدمی کو کچھ مادی کامیابی حاصل ہوئی۔ کامیابی کو پا کر اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرا۔ مگر عین اسی وقت اس کے دل میں ایک اور خیال آ گیا۔ اس نے سوچا کہ میرے پڑوسی کو جو ترقی حاصل ہوئی ہے وہ میری ترقی سے بہت زیادہ ہے۔ پہلے وہ خود اپنے ماضی کا اپنے حال سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اب وہ اپنے حال کا اپنے پڑوسی کے حال سے مقابلہ کرنے لگا۔ اس فرق نے اس کے احساسات کو بدل دیا۔ جس سینہ میں پہلے شکر کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ اب اسی سینہ میں حسد اور شکایت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں شیطانی وسوسہ کہا گیا ہے۔ (الذی یوسوس فی صدور الناس) شیطان انسان کا دشمن ہے۔ وہ انسان کے دل پر حملہ کرتا ہے۔ وہ انسان کی سوچ کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اس طرح شیطان ہر وقت اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ انسان کو صراط مستقیم سے منحرف کر دے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس کے اندر فطری طور پر تمام شریفانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کسی شخص کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو فوراً اس کے اندر احسان مندی کا جذبہ پیدا ہو گا۔ مگر عین اسی وقت شیطان اس کے دل میں یہ خیال ڈالے گا کہ اگر تم نے احسان مانا تو تم اپنے کو چھوٹا کر لو گے۔ اکثر انسان اس وسوسہ کا شکار ہو جاتے ہیں اور احسان مندی کے بجائے احسان فراموشی کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ایک شخص کو آپ کے بارے میں غلط فہمی ہو گئی۔ آپ نے دلیل کے ساتھ اس کی غلطی کی وضاحت کی۔ اس کے بعد فطری طور پر آدمی کے اندر اعتراف کا جذبہ ابھرے گا۔ مگر عین اسی وقت شیطان اس سے کہے گا کہ اگر تم نے اعتراف کیا تو تم خود ہی اپنا درجہ گھٹا لو گے۔ اس خیال کے آتے ہی آدمی اپنے فطری احساسات کو دبا دے گا اور اپنی غلطی کو ماننے سے انکار کر دے گا۔

اسی طرح شیطانی وسوسہ کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ کسی مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنادے۔ دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو تو ابتدائی طور پر وہ ایک سادہ نزاع ہوتی ہے باہمی گفت وشنید کے ذریعہ اس کو حل کیا جاسکتا ہے۔ مگر جب وہ بڑھ کر ساکھ اور وقار کا مسئلہ بن جائے تو اس کے ساتھ ایک ناقابل حل پیچیدگی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

نزاع پیدا ہونے کی صورت میں ابتدائی طور پر آدمی صرف نفع اور نقصان کو دیکھتا ہے۔ ایسی حالت میں نزاع کو ختم کرنا مشکل نہیں ہوتا مگر نزاع کا معاملہ جب بڑھ کر وقار کا معاملہ بن جائے تو آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے فریق ثانی کی بات مان لی تو میری بے عزتی ہو جائے گی۔ اسی کا نام شیطانی وسوسہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ کوئی معاملہ جب اپنی سادہ حالت سے آگے بڑھ کر عزت ووقار کا معاملہ بننے لگے تو وہ چوکنا ہو جائے۔ وہ جان لے کہ اب اس معاملہ میں شیطان وسوسہ اندازی کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ وہ شیطان کے مقابلہ میں خدا کی پناہ مانگے اور لڑ کر ایسے خیال کو اپنے دماغ سے نکال دے۔

ہر آدمی اس شیطانی وسوسہ کی زد میں ہے۔ نجات یافتہ وہ ہے جو فطرت کی آواز پر چلے اور شیطانی وسوسہ کو ماننے سے انکار کر دے۔

سوال

آپ کا مضمون "تصویر کا فتنہ" (الرسالہ جنوری ۱۹۹۹) پڑھا گیا۔ بظاہر یہ مضمون ان باتوں کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جو آپ کے خلاف ایک ہندی اخبار میں شائع شدہ رپورٹ کی بنیاد پر کہی جارہی تھیں۔ مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کا یہ مضمون اس معاملہ میں آپ کی صفائی کے لئے کافی نہیں۔ یہ مضمون ایک بالواسطہ تردید ہے۔ جب کہ اتنے سنگین معاملہ میں آپ کو براہ راست تردید کرنا چاہئے۔ یعنی غیر مبہم انداز میں اس طرح کہنا چاہئے کہ میں نے فلاں فعل نہیں کیا۔ (شمس پیرزادہ بمبئی)

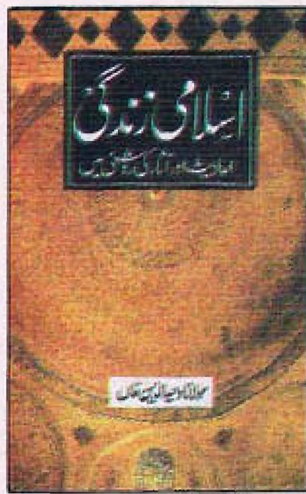
جواب

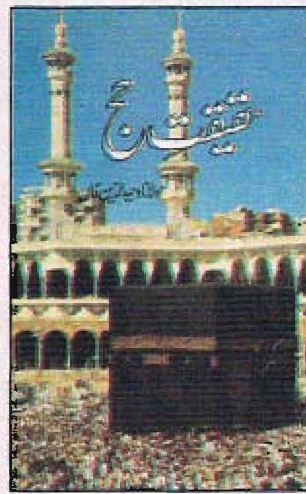
میرا یہ وضاحتی مضمون قرآنی اور اسلامی اصول کے عین مطابق ہے۔ جو لوگ اس معاملہ میں براہ راست تردید کا مطالبہ کریں ان کے متعلق یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ یا تو اسلامی تعلیمات سے بے خبر ہیں یا ان کا مقصد صرف مجھ کو مطعون کرنا ہے نہ کہ حقیقی صورت حال کو جاننا۔ حضرت عائشہؓ کا واقعہ اس معاملہ میں اسلامی اصول کو جاننے کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ۶ ھ میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک ناخوشگوار معاملہ پیش آیا۔ حضرت عائشہ رسول اللہ کے ساتھ ایک سفر میں تھیں۔ ایک اتفاقی حادثہ کے تحت وہ قافلہ سے بچھڑ گئیں۔ بعد کو وہ ایک مسلم نوجوان صفوان بن معطل کے ساتھ مدینہ پہنچیں۔ جب وہ مدینہ میں داخل ہوئیں تو اس طرح انھیں ایک نوجوان کے ساتھ آتے ہوئے دیکھ کر عبداللہ بن ابی نے کہا: واللہ مانجت منہ ولا نجا منہا (تفسیر النسفی الجزء الثالث صفحہ ۱۳۴) یعنی نہ وہ اس سے بچی ہیں اور نہ وہ ان سے بچا ہے۔ عبداللہ بن ابی کی یہ بات تیزی سے سارے مدینہ میں پھیل گئی۔ حضرت عائشہ پر نعوذ باللہ وہ بیہودہ الزام لگایا گیا جس کو اسلام کی تاریخ میں واقعۂ افک کہا جاتا ہے۔ کمزور ایمان والے لوگ اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ پورے مدینہ میں اس کا چرچا پھیل گیا۔

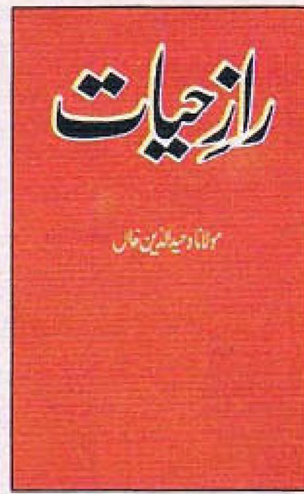
مگر حضرت عائشہؓ نے اس معاملہ میں کوئی براہ راست "تردیدی بیان" نہیں دیا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ میں پیغمبر یعقوب کی سنت کے مطابق اس معاملہ میں صبر جمیل کا طریقہ اختیار کروں گی (۱۶۲) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ قصہ بہت بڑھا تو رسول اللہ ﷺ از راہ شفقت حضرت عائشہ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے عائشہ تم کو وہ بات پہنچ چکی ہے جو کہ لوگ کہہ رہے ہیں پس تم اللہ سے ڈرو۔ اگر تم اس برائی میں پڑی ہو جیسا کہ لوگ کہہ رہے ہیں تو اللہ سے توبہ کر ۔ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عائشہ بے اختیار رونے لگیں۔ پھر انھوں نے کہا: والله لااتوب الى الله مماذكرت ابدا والله انى لاعلم لئن اقررت بما يقول الناس والله يعلم انى منه بريئة لاقولن مالم يكن ولئن انا انكرت مايقولون لاتصدقوننى (البداية والنهاية لابن كثير ، الجزء الرابع ، صفحه ۱۶۲) خدا کی قسم جس چیز کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کے بارے میں تو میں کبھی اللہ سے توبہ نہ کروں گی۔ خدا کی قسم میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اگر میں لوگوں کی کہی ہوئی بات کا اقرار کروں گی، اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں، تو میں ایسی بات کہوں گی جو واقع نہیں ہوئی۔ اور اگر میں ان کی بات کا انکار کرتی ہوں تو آپ لوگ اس کی تصدیق نہیں کریں گے (ترجمہ) اس سلسلہ میں دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ عائشہ صدیقہ کے خلاف یہ بیہودہ الزام ایک مہینہ سے زیادہ مدت تک مدینہ میں گونجتا رہا۔ لوگ اس انتظار میں تھے کہ خدا کی طرف سے کوئی واضح حکم آئے جو اس معاملہ میں تمام شکوک کو مکمل طور پر ختم کر دے۔ لمبے انتظار کے بعد آخر کار سورہ النور اتری مگر قابل لحاظ بات یہ ہے کہ خود سورہ النور میں بھی براہ راست تردید کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جس کا مطالبہ الزام لگانے والوں کی طرف سے کیا جارہا تھا۔ اس کے برعکس قرآن میں بالواسطہ تردید کا انداز اختیار کرتے ہوئے صرف یہ الفاظ نازل ہوئے: ان الذين جاؤ ا بالافك عصبة منكم (النور ۱۱) یعنی جو لوگ یہ افک لائے ہیں وہ تمہارے اندر ہی کا ایک

گروہ ہے۔ قرآن کے اس اسلوب سے ایک اہم شرعی مسئلہ معلوم ہوتا ہے جس کی وضاحت بعض مفسرین نے اپنی کتاب میں کی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں اس معاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: افک، جھوٹی، من گھڑت، خود تراشیدہ اور خلاف حقیقت بات کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے اشارہ اس فتنہ کی طرف ہے جو غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو متہم کرنے کے لئے برپا کیا۔ بعض جھوٹ ایسے ہوتے ہیں جن کا ذکر بھی زبان پر لانا گوارا نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کی طرف لفظ افک سے اشارہ کر کے اس کو نظر انداز کر دیا (تدبر قرآن، جلد چہارم صفحہ ۵۱۴) معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ کے معاملہ میں قرآن میں براہ راست تردید کا انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ مثلاً قرآن میں اس سلسلہ میں اس طرح کے صریح الفاظ نہیں آئے کہ: ماقارفت عائشه بلکہ صرف بالواسطہ انداز میں اس کو افک قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اسی طرح خود حضرت عائشہؓ کے ذوق ایمانی نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے اپنی زبان سے براہ راست تردید کریں۔ مثلاً وہ اپنی زبان سے اس قسم کے الفاظ بولیں کہ: والله ماقارفتُ اس معاملہ میں مومنین و صالحین کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے۔ علامہ ابن عبد البر نے اپنی کتاب (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی صفحہ ۹۵) میں لکھا ہے کہ طاؤس اور وہب ابن منبہ تابعی (وفات ۱۱۴ھ) دونوں ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا۔ اے ابو عبد اللہ میں نے آپ کے بارے میں ایک سنگین بات سنی ہے۔ انھوں نے پوچھا کیا بات۔ طاؤس نے کہا۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ اللہ ہی تو تھا جس نے قوم لوط کو ایک دوسرے پر سوار کیا۔ وہب نے یہ سن کر کہا۔ اللہ کی پناہ۔ پھر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے پوچھا کیا دونوں میں کوئی بحث ہوئی۔ راوی نے کہا نہیں (روینا ان طاؤسا ووهب ابن منبه التقیافقال طاؤس لوهب یا ابا عبدالله بلغني عنك امر عظيم فقال ماهو. قال تقول ان الله حمل قوم لوط بعضهم على بعض. قال اعوذ بالله. ثم سكتا. قال فقلت هل اختصما، قال لا) اس

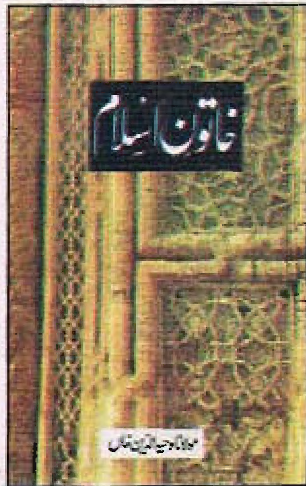
واضح اور ثابت شدہ شرعی اصول کے باوجود جولوگ ایک بیہودہ الزام کے بارے میں براہ راست تردید کا مطالبہ کریں وہ خود اپنے بارے میں اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ اسلام کی تعلیمات سے اور اس کی روح سے بالکل بے خبر ہیں۔ وہ اس معاملہ میں اسلام کے ثابت شدہ اصول کو نہیں جانتے۔ وہ یہ کہ بیہودہ قسم کے الزام کے بارے میں جب زیر الزام شخص یہ کہہ دے کہ استغفر اللہ، یہ ایک لغو اور بے بنیاد بات ہے تو اسی پر معاملہ کو ختم ہو جانا چاہئے۔ زیر الزام شخص کی زبان سے ایسا جملہ سننے کے بعد سائلین یا معترضین پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ چپ ہو جائیں نہ کہ نئے نئے شوشے نکال کر اس کے بعد بھی وہ اپنے الزام کو دہراتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ وضاحت کے بعد ان پر لازم ہے کہ وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کریں۔ اگر بالفرض اب تک وہ مجرم نہ ہوں تو مذکورہ وضاحت کے باوجود ان کا عدم اعتراف یقینی طور پر انھیں مجرم بنادے گا۔ اس طرح کے معاملہ میں کھلے اعتراف سے کم کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول نہیں۔ مذکورہ قرآنی اصول کے مطابق، زیر الزام شخص کی طرف سے صرف بالواسطہ تردید ہی کافی ہے۔ اس کے بعد ساری ذمہ داری ان لوگوں کی طرف چلی جاتی ہے جنھوں نے بے بنیاد طور پر کسی شخص کے اوپر بیہودہ الزام لگایا تھا۔ یہ لوگ چونکہ براہ راست زبان میں الزام تراشی کے مجرم بنے تھے اس لئے اس کے بعد انھیں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اب براہ راست زبان میں اپنی مجرمانہ غلطی کا اعتراف کریں۔ اگر وہ اس کے بعد بھی کھلا اعتراف نہ کریں تو وہ دہرا مجرم قرار پائیں گے۔ پہلے اگر انھوں نے سادہ طور پر صرف گناہ کا فعل کیا تھا تو اب وہ بے اعترافی کے نتیجہ میں اپنے گناہ پر سرکشی کا اضافہ کریں گے۔ گناہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل معافی ہو سکتا ہے مگر سرکشی یقینی طور پر قابل معافی نہیں۔

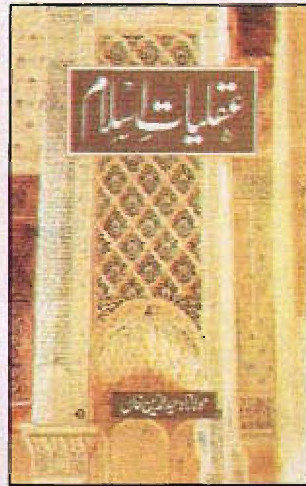

اسلامی زندگی
مولانا وحید الدین خاں

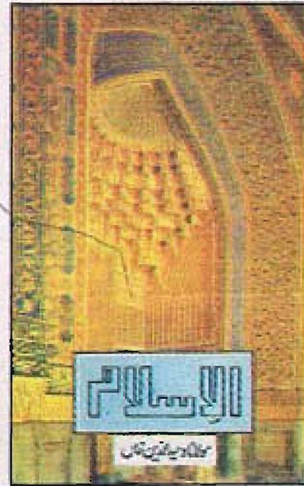

حقیقت حج
مولانا وحید الدین خاں

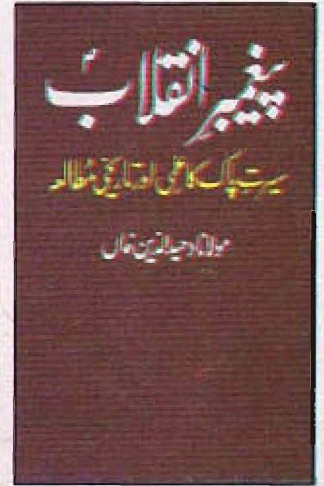

رازِ حیات
مولانا وحید الدین خاں

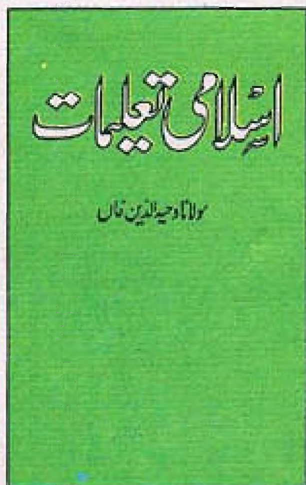

تجدید دین

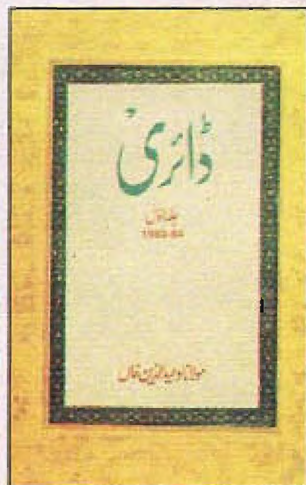

خاتون اسلام
مولانا وحید الدین خاں

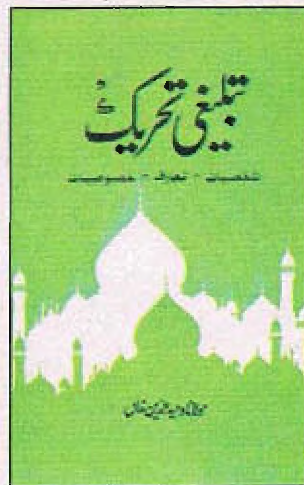

عقلیاتِ اسلام
مولانا وحید الدین خاں

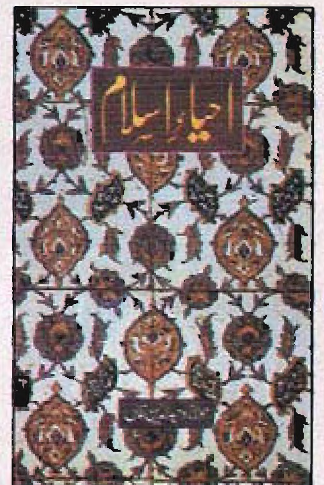

الاسلام
مولانا وحید الدین خاں


پیغمبرِ انقلاب
سیرت پاک کا علمی اور تاریخی مطالعہ
مولانا وحید الدین خاں

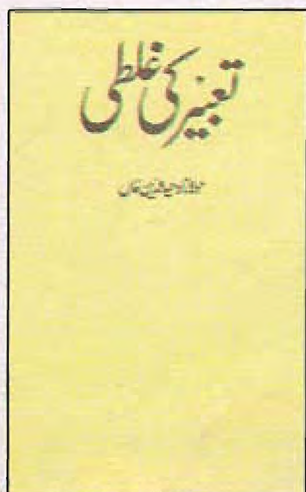

اسلامی تعلیمات
مولانا وحید الدین خاں

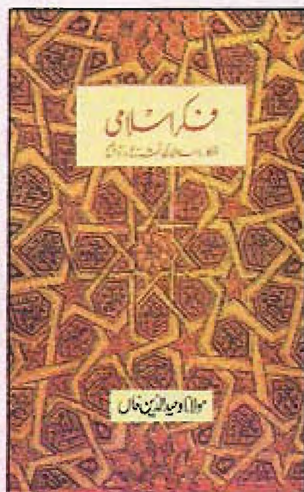

ڈائری
1983-84
مولانا وحید الدین خاں


تبلیغی تحریک
مولانا وحید الدین خاں


احیاءِ اسلام


عظمتِ قرآن


تعبیر کی غلطی
مولانا وحید الدین خاں


فکر اسلامی
مولانا وحید الدین خاں


الاسلام تجدیدی
وحید الدین خان
مکتبہ الرسالہ